قسط نمبر 31

''انسان شر اس طرح مانگتا ہے جس طرح خیر مانگنی چاہیے، انسان بڑا ہی جلد باز واقع ہوا ہے''

اسلم خان درانی پولیس کے حصار میں اپنی حویلی آیا تھا۔اس حویلی میں کبھی اس کا دبدبہ تھا، قدموں کی گونج سب کو سہمائے دیتی تھی، بلند لہجہ کسی دوسرے کو بولنے کے قابل نہیں چھوڑتا تھا لیکن اس لمحے وقت کا تھال الٹ چکا تھا۔حثیت ایسی بدلی کہ وہ اپنی ہی حویلی میں مجرم کی مانند لایا گیا۔وہ دوسروں کی موت کا پروانہ جاری کرتے کرتے اپنے ظلم کا حساب دینا بھول دیا گیا تھا۔ایک جھٹکے نے اس کو اس کی رعونیت سمیت جڑ سے اکھاڑ پھینکا اور وہ بے بس نگاہوں سے سب ہوتے دیکھ رہا تھا۔ اسے اس قابل بھی نہیں چھوڑا گیا کہ وہ ہلکی سی چیخ بلند کر پاتا۔

انہوں نے زخمی نگاہوں سے عائشہ کو کرلاتے ہوئے، سفید کفن میں لپٹے وجود کو چھو کر بے حال ہوتے دیکھا۔قدموں میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ آگے بڑھ کر اپنی نسل کے آخری چراغ کا آخری دیدار کر لیتے۔وہ جو کبھی عزیز نہیں رہا تھا، جس کی باغی حرکات پہ غصہ آتا، جو ہمیشہ ان سے مخالف سمت پہ چلتا رہا اور جس کو کئی بار وراثت سے عاق کر دینے کی دھمکیاں دیتے رہے آج وہ بے سدھ لیٹا تو زیاں کا احساس ہو رہا تھا۔وہ انجانے میں اکرم خان کے بیٹے، اپنے پوتے کے خون سے ہاتھ رنگ چکے تھے۔اس لمحے ادراک ہو رہا تھا کہ اسلم خان درانی نے کیا کھویا تھا۔وہ اس سے ناراض تھے، سرکوبی کا ارادہ بھی تھا مگر اسے جان سے نہیں مارنا چاہتے تھے۔یہ منظر دیکھنا مشکل ہوا تو رخ موڑ کر سارے احاطے پہ نظر ڈالی، ہر آنکھ میں اپنے لیے نفرت دکھائی دے رہی تھی۔

خود سے کچھ فاصلے پہ کھڑے انسان کی آنکھوں سے لپکتے شعلوں نے متوجہ کیا تو وہ اسی جانب دیکھنے لگے۔پہچان کا مرحلہ طے کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگا وہ ہو بہو اپنے باپ ندیم درانی کا ہم

شکل تھا لیکن وہ یہاں کیسے پہنچ سکتا تھا۔ انہوں نے ابراہیم کی موجودگی کو وہم سمجھا اور آنکھیں بھینچ کر دوبارہ کھولیں لیکن وہ وہیں کھڑا نفرت سے دیکھ رہا تھا۔ وہ سالوں سے اسے تلاش کر رہے تھے، اسے ڈھونڈنے کی خاطر کیا کیا پاپڑ نہیں بیلے۔ وہ اسے دھوکہ دہی کی سزا دینا چاہتے تھے اور آج وہ خود چل کر آیا تھا تو ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں۔

سوچوں کا ربط کلمہ شہادت کی صدا نے توڑ ڈالا۔ وہ ہڑبڑائے کہ ابھی تو نبیل کا آخری دیدار بھی نہیں کیا اور اسی مقصد کے تحت آگے بڑھے لیکن ایک دم تھم گئے۔ عائشہ ان کے سامنے کسی دیوار کی مانند حائل تھی اور سر مسلسل انکار میں ہلا رہی تھی۔

''مجھے اس کا چہرہ دیکھنے دو عائشہ.....'' لہجے میں غریب جیسی بیچارگی تھی۔

''کبھی نہیں..... بالکل بھی نہیں.....'' وہ اس قدر زور سے چیخیں کہ ہر منظر ساکت ہو گیا۔ مدھم چہ مگوئیاں بھی دم توڑ گئیں۔

''دیکھنے دیں بھابھی.....'' ایک عورت عائشہ کے قریب ہوئی۔

''نہیں کلثوم..... کبھی نہیں۔''

''اجازت دے دیں بھابھی..... اس کا ساکت، موت کی زردی سے پیلا پڑتا چہرہ دیکھنے دیں کیونکہ یہ منظر ہی انہیں تمام عمر سونے نہیں دے گا۔''

''میری زندگی اجاڑ دی اس انسان نے، میری عمر بھر کی جمع پونجی لوٹ لی..... میرا بیٹا مار دیا.....'' ماں کی دہائی ہر آنکھ نم کر رہی تھی۔

''میری کوکھ بھی تو اس انسان نے اجاڑی تھی بھابھی لیکن ابھی ان باتوں کا وقت نہیں ہے۔ آ جائیں، اس طرف آئیں۔'' وہ عائشہ کو لیے ایک طرف کو ہٹ گئیں۔

اسلم خان کے قدم آگے بڑھتے ہوئے من بھر وزنی ہو گئے۔ جسم اس قدر وزنی ہو گیا جیسے عمر بھر کے گناہ کسی طوق کی صورت گلے میں ڈال دیے گئے ہوں۔ تابوت کے قریب پہنچ کر ایک نظر ڈالی اور وہ ہی دل چیر کے رکھ گئی۔ دوسری نگاہ ڈالنے کا حوصلہ ہی ہوا، اس کے مردہ چہرے کی مسکراہٹ نے مزید کچھ

دیکھنے کے قابل نہیں چھوڑا۔ یہاں وہ نیچے گرے وہاں ایک مجمع اس کا تابوت اٹھائے حویلی کے خارجی دروازے کی جانب بڑھ گیا۔

''یہ آپ نے کیا کر دیا خان جی.....'' یہ رکھی تھی ملازمہ خاص جو مجمع چھٹ جانے کے بعد ان کے قریب چلی آئی۔

''میں اسے نہیں مروانا چاہتا رکھی..... بالکل بھی نہیں..... وہ لاکھ میرے خلاف سہی مگر میں ایسا کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ وہ میرا خون تھا، میرا آخری وارث، میرے اکرم کا بیٹا.....'' وہ داڑھیں مار مار کر رونے لگے تھے مگر اب کیا حاصل.....

''جنازہ تو پڑھ لیجیے.....'' رکھی نے وقت گزرنے کا احساس کرایا۔

''نہیں رکھی..... میں اس قابل نہیں کہ اس کا جنازہ پڑھوں۔''

''ابراہیم لوٹ آیا ہے۔''

''اب سب اسی کا تو ہے رکھی..... میرے ہاتھ تو خالی ہیں۔'' انہوں نے پولیس کو اپنی جانب بڑھتے دیکھا تو اٹھ کھڑے ہوئے۔ اب شائد کبھی واپس نہ آنے کے لیے جانا تھا۔

''خان جی! میں بھی اب حویلی سے چلی جاؤں گی۔ آپ کا نمک کھایا تھا اور آپ کا ساتھ دینے کے لیے نہ جانے کیا کیا ظلم کیے مگر اب خوف آنے لگا ہے۔ خدا کا انصاف بڑا سخت ہے، اس کی پکڑ سے پہلے توبہ کرنا چاہتی ہوں۔''

''حویلی سے نہ جا رکھی، میری بات آخری حکم سمجھ کر مان لے۔ یہاں رہ اور عائشہ کا خیال رکھ۔ میں نے اسے تیرے حوالے کیا۔'' اسلم خان پولیس کے حصار میں آگے بڑھ گیا۔

''بے شک انسان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے اور بے شک وہ اس پر خود گواہ ہے''

☆.....☆.....☆

کمرے میں داخل ہوتے ان کا سامنا مدھم اندھیرے سے ہوا۔ انہیں ایسے ہی منظر امید تھی اس لیے آہستگی سے آگے بڑھے اور دبیز پردے ہٹاتے ہوئے روشنی کو اندر آنے کا راستہ دیا۔ سورج کی

روشنی کمرے میں آتے ہی ہر منظر واضح ہو گیا۔ انہوں نے کمرے میں پہلے سے موجود انسان کو دیکھا جو بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے نیم دراز تھیں۔

''آج آپ کا کمرے سے باہر نکلنے کا ارادہ نہیں ہے؟'' وہ وہیں ٹانگوں کی جانب بیٹھ گئے۔

''جی ہی نہیں چاہ رہا حضور۔ زندگی کی روشنی سے دل اکتا سا گیا ہے۔'' ان کے ساکت وجود میں کوئی ہلچل نہیں ہوئی تھی۔

''آپ اس طرح ہمت ہار جائیں گی تو حویلی کو کون دیکھے گا؟''

''یہاں کچھ بھی لازم نہیں ہے حضور۔ کاروبار زندگی کب کسی کے لیے رکا ہے۔ میرے نہ دیکھنے سے حویلی کے معاملات کب رک جائیں گے..... سب ویسے ہی چلتا رہے گا۔''

''آپ کو اس قدر آزردہ اور مایوس کبھی نہیں دیکھا نور۔'' اب انہیں واقعی تشویش ہونے لگی تھی۔

''میں خود سمجھنے سے قاصر ہوں۔ عمر بھر جتنے صدمے سہہ لیے اب تو عادت ہو جانی چاہیے تھی مگر پھر بھی ہر جھٹکا جان کا آزار بن جاتا ہے۔ ساری رات آنکھوں کے پردے سے اس بیچاری عورت کا چہرہ نہیں ہٹا جس کی کل دنیا اکلوتا بیٹا تھا۔ یہ قیامت اس نے نہ جانے کیسے سہی ہو گی، کیسے اپنے لخت جگر کو آخری سفر پہ روانہ کیا ہو گا۔'' انہوں نے ہاتھ بڑھا کر آنکھ میں آئے آنسو صاف کیے۔ ''خدا بھی اپنے بندوں کو کیسے کیسے آزماتا ہے۔''

''جنازہ گاہ میں سب اسلم خان کا ذکر کر رہے تھے پولیس اسے لے کر آئی تھی مگر نبیل کی ماں نے چہرہ نہیں دیکھنے دیا اور شائد اسی وجہ سے وہ قبرستان میں بھی دکھائی نہیں دیا۔ جس دولت و جائیداد کے لالچ میں وہ اندھا ہو چکا تھا اس میں سے ایک پائی بھی اس کے حصے نہیں آئی۔ اس کی ضد، غرور اور اکڑ نے اسے منہ کے بل گرا دیا۔ جن لوگوں پہ رعب دبدبہ جمائے رکھنے کے لیے ظلم کی انتہا کرتا گیا آج وہ سب لوگ اس کے منہ پہ تھوک رہے تھے۔'' ان کا سخت دل بھی کہانی کے اس انجام پہ رنجیدہ تھا۔

''تاشفین کو جب یہ معلوم ہو گا تو نہ جانے اس کی کیا حالت ہو گی۔'' ان دونوں کی دوستی سے کون واقف نہیں تھا۔ یہ بھی معلوم ہو چکا تھا نبیل تاشفین کو بچاتے ہوئے زیادہ زخمی ہوا تھا۔ انہیں آنے والے

لمحے سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔

''صدمہ تو بہت بڑا ہے لیکن جو مشکل دیتا ہے وہی آسانی کی نوید بھی سناتا ہے۔ ہمیں شکر کرنا چاہیے اللہ نے ہمیں اس آزمائش سے بچالیا۔ ان شاء اللہ یہ کٹھن وقت بھی گزر جائے گا۔ آپ بھی اٹھیے ،باہر کے حالات دیکھیں۔''

''باہر کیا ہوا ہے؟'' وہ ایک دم سے سہم گئیں۔ اب تو دل ہر وقت کسی انہونی کے خیال سے کانپتا رہتا تھا۔

''کچھ نہیں ہوا تسلی رکھیے۔'' انہوں نے فوراً ہاتھ تھام کر ہمت بندھائی۔ ''میں آپ سے یہ ہی کہہ رہا ہوں حالات بگڑنے سے پہلے سدباب کر لینا چاہیے۔ آپ کمرے سے باہر نکلیں گی تو صورتحال سمجھ آئے گی۔''

''آپ کس کے متعلق بات کر رہے ہیں؟''

''میں اس لڑکی کی بات کر رہا ہوں جسے کل ودود لے کر آیا ہے۔'' ان کے کہنے کی دیر تھی کہ سارا واقعہ آنکھوں کے پردے پہ روشن ہو گیا۔

وہ سہمی ہوئی لڑکی کلثوم کی بیٹی تھی۔ وہ ابھی تک اس انہونی پہ یقین نہیں کر پا رہی تھیں۔ اس کے موبائل پہ تصاویر دیکھنے کے بعد بھی دل بے یقین تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ بائیس سال ایک انجان قبر پہ آنسو بہاتی رہیں۔ ان بائیس سالوں میں کلثوم نے ایک بار واپسی کا نہیں سوچا اور اگر وہ زندہ تھی تو دل نے اس کی موت پہ یقین کیسے کر لیا۔ آج سالوں بعد اس نے اپنی بیٹی یہاں کیوں بھیجی ..... کیا سالوں بعد اسے ماں یاد آئی بھلا بیٹیاں اتنی پتھر دل کب سے ہونے لگیں مگر میری تو ساری اولاد ہی پتھر نکلی۔ خاندانی روایات توڑتے توڑتے انہیں کا شکار بن گئے۔

''اب آپ کیا سوچنے لگیں؟'' انہیں سوچوں میں گم دیکھ کر احمد علی نے پکارا۔

''سارے فیصلے ہمیشہ آپ خود ہی کرتے آئے ہیں تو اب مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟''

''آپ کی اولاد کو میرے لیے گئے فیصلوں پہ ہمیشہ اعتراض رہا ہے اور آپ نے بھی تو تمام عمر

مجھے الزام دیا ہے۔ ہر مشکل کا ذمہ دار مجھے ٹھہرایا ہے۔ اب مزید الزام سہنے کی ہمت نہیں اس لیے ہر معاملے میں آپ کی خواہش اول رہے گی۔" انہیں آج اندازہ ہو رہا تھا کہ حضور کو ان سے کتنے شکوے تھے۔

"آپ غلط سوچ رہے ہیں حضور۔ میں نے تمام عمر آپ کے ہر فیصلے کو خاموشی س تسلیم کیا ہے اور آپ کی اولاد کو بھی یہ ہی کرنے کی تلقین کی ہے۔ ہاں کچھ فیصلے غلط تھے، ان فیصلوں میں باپ کی شفقت کم اور خاندانی رسوم، کاروباری مقاصد زیادہ تھے۔ میں نے رقیہ کی بار آپ کو منع کیا، اس کی آنا فانا شادی سے روکا مگر آپ کو مختار احمد کے ساتھ کاروبار عزیز تھا سو آپ نے اپنی مرضی کی۔ سعد نے کسی گانے والی سے محبت کر لی میں نے آپ کی منت کی کہ یہ رشتہ قبول کر لیں شائد اس کی آوارگی تھم جائے مگر آپ نے اسے اپنے مزاج اور خاندان کے وقار کے خلاف سمجھا۔ اس نے حور کی صورت ایک اور غلطی کی تو آپ کو قبول کرتے بنی مگر تب تک تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ آپ کو کئی بار کہا سعد کے متعلق سنجیدگی سے سوچیں مگر آپ اپنی بدنامی کے ڈر سے خاموش رہے۔ کلثوم کا وقت یاد کیجیے کتنے واسطے دیے تھے آپ کو کہ اس کی پسند کا لڑکا ایک بار دیکھ لیں مگر آپ کا انکار، انکار ہی رہا۔ سعد اسے مارنے نکلا تب میں آپ کے قدموں میں بیٹھ گئی کہ اسے جینے دیں مگر آپ نے میری ایک نہ سنی۔" ان کا سانس بولتے بولتے پھول گیا اس لیے کچھ دیر کی خاموشی چھا گئی۔ "آپ تو حویلی سے باہر مصروف رہے حضور مگر مجھ سے پوچھیں یہاں کی ویرانی نے مجھے کتنی بار مارا ہے۔ میری ساری اولاد بکھر گئی اور میں ان سب کی یاد میں تڑپتی رہی۔ آپ اور آپ کی اولاد سب میرے مجرم ہیں۔ آپ سب نے میری زندگی آنسوؤں کا تالاب بنا دی۔" ان کا لہجہ بھیگ گیا لیکن آنسو آنکھ کے اندر کہیں اٹکے تھے۔

"آپ نے مجھے باپ نہیں مجرم بنا دیا۔ خیر اب آپ کیا چاہتی ہیں نور بیگم۔" انہوں نے دل کے تاثرات اندر کہیں گہرائی میں چھپاتے ہوئے ان سے پوچھا۔

"اس بچی اور ودود کے معاملے میں آپ کوئی سخت فیصلہ نہیں لیں گے۔ وہ دونوں واقعی ہی نکاح کر چکے ہیں تو ان کے رشتے کو تسلیم کر لیں گے۔"

"میں نے فضل داد سے پوچھ لیا ہے فارم ہاؤس میں نکاح ہو چکا ہے۔"

''پھر ٹھیک ہے۔تاشفین اور حورالعین کے گھر آتے ہی ولیمہ کی تقریب رکھ لیں۔''

''اور نورالعین.....آپ اسے بھول رہی ہیں، اسے نظر انداز کر رہی ہیں۔اس رشتے کو تسلیم کرنا بچی کے ساتھ زیادتی ہوگی اور اس کے ماں باپ جو تماشہ لگائیں گے وہ الگ ہے۔'' انہیں نور بیگم پہ حیرانی ہوئی جو اتنی آسانی سے نورالعین کو نظر انداز کر رہی تھیں۔

''ودود اس رشتے کے لیے راضی تھا اور نہ نورالعین۔اس کے لیے بھی ان شاء اللہ بہتر ہوگا۔''

احمد علی چٹھہ نے نور بیگم کے چہرے پہ اطمینان کی جھلک دیکھی تو مزید کچھ بولنے کا ارادہ ترک کر دیا۔اب وہ معاملات کو نئے طریقے اور نئی سوچ سے حل کرنا چاہ رہے تھے۔آج کے سانحے نے اندر کہیں دور تبدیلی کی پہلی اینٹ رکھ دی تھی۔

☆.....☆.....☆

لامیہ کمرے میں بیٹھ بیٹھ کر تھک گئی تھی۔جگہ کی تبدیلی کے باعث رات آرام سے سو نہیں پائی، دروازے کو مقفل کرنے کے باوجود ان جانے وسوسے ستاتے رہے۔صبح بھی کمرے میں ناشتہ بھجوا دیا گیا تھا۔وہاں کے مکینوں کے رویے سمجھنا بے حد مشکل کام تھا کیونکہ ودود جس طرح لینے آیا تھا اسے اپنے پر جوش استقبال کی امید تھی جب کہ یہاں ایسا کچھ نہیں تھا۔اس سے کسی نے ٹھیک طرح سے بات بھی نہیں کی اور رات سے اکیلی یہاں بند تھی سوائے ناشتے دینے کے کوئی ملازم بھی اس طرف نہیں آیا تھا۔ تنہائی اور خاموشی سے جھنجلا کر کمرے سے باہر نکل آئی۔

وہ حویلی سے مکمل انجان تھی۔کمرے سے نکلتے ہی تین جانب جاتی راہداریاں مشکل بڑھا رہی تھیں۔اس نے سرسری نظر تینوں جانب ڈالی اور پھر سیدھا ہی آگے بڑھ گئی۔اس کی نگاہیں دیواروں پہ مزین نقاشی کے کام کو دیکھ رہی تھیں ،کہیں کہیں مصوری کے بے انتہا خوبصورت فن پارے بھی آویزاں تھے اور ہر آرائشی چیز اس قدر خوبصورت تھی کہ وہ متاثر ہوئے بنا رہ نہیں پائی۔راہداری کا اختتام ہوتے ہی قدم رک گئے اور اس کی وجہ دیوار پہ لٹکا ہوا ہرن کا سر تھا، اس کے ساتھ ایک لمبی سی بندوق بھی لٹکی ہوئی تھی اور یہ واحد منظر تھا جسے دیکھ کر اسے کراہیت محسوس ہوئی۔اس کے چہرے پہ نظر آتے تحسین کے

جذبات بھک سے اڑ گئے۔ وہ سجاوٹ کے اس طریقے کو سخت ناپسند کرتی تھی، جانوروں ساتھ ایسا سلوک غیر انسانی لگتا تھا۔

''آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟'' وہ ہرن کے سر کو دیکھنے میں مگن تھی جب عقب سے آواز آنے پہ چونک گئی۔ اس کے قریب وہی ملازمہ کھڑی تھی جو ناشتہ دینے آئی تھی۔

''کیوں؟ یہاں آنا منع ہے کیا؟'' مقابل کا چہرہ اس قدر سہما ہوا تھا کہ اسے اپنا یہاں آنا غلط لگا۔

''نہیں..... منع نہیں ہے..... بس وہ.....'' اس سے کوئی جواب نہیں بن پایا تھا۔ ''آپ یہیں رکیں میں کسی کو بلا کر لاتی ہوں۔'' وہ اسے چھوڑ کر ایسی رفو چکر ہوئی کہ لامیہ کو حیران ہونے کا وقت بھی نہیں ملا۔

اس نے سر جھٹک تک اردگرد دیکھا تو چند قدموں کے فاصلے پہ دروازہ نظر آیا۔ وہ اسی طرف چلی آئی اور دروازہ کھولتے ہی سامنے ہرا بھرا احاطہ نظر آنے لگا۔

''ارے واہ! یہ تو بہت خوبصورت جگہ ہے۔'' اونچے اونچے درخت، کئی رنگوں کے پھول، برآمدے میں بچھا تخت اور اس پہ موجود گاؤ تکیے سب اسے بے حد حسین لگا تھا۔ وہ رات میں یہاں آئی تھی تو اندھیرے کے سبب کچھ بھی نہیں دیکھ سکی اور اب وسیع باغ کے درمیان کھڑے ہو کر تازہ ہوا سانس کے ذریعے اندر لے جاتے ہوئے بے انتہا سکون مل رہا تھا۔ اس نے جوتے اتار کر نرم گھاس پہ پاؤں رکھ دیے اور ننگے قدموں چلنے لگی۔ اس لمحے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ سڈنی کے ساحل پہ چل رہی ہو ویسا ہی سکون وہ لمحہ تھا۔ کیاریوں میں لگے گلاب ہوا کے دوش پہ لہرا لہرا کر اٹھکیلیاں کرتے ہوئے اسے اپنی جانب متوجہ کر رہے تھے۔ اسے پھول توڑنا پسند نہیں تھا لیکن اس وقت ایسی بے اختیار ہوئی کہ ہاتھ بڑھا کر ایک گلاب توڑ لیا۔ پھول کو چہرے کے قریب کرتے ہوئے خوشبو وجود میں اتاری اور وہاں سے آگے چل دی۔

قدرتی مناظر کو محسوس کرتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھی کہ نگاہ سفید پتھروں پہ جا پڑی۔ اس نے حیرانی سے وسیع لان میں موجود ان پتھروں کو دیکھا جیسے ان کی یہاں موجودگی کا سبب جاننا چاہ رہی ہو۔ کتنے ہی لمحوں بعد پتھروں کی ہیئت دیکھ کر خیال آیا یہ ایک قبر تھی۔ وہ دھیرے دھیرے اس جانب بڑھنے لگی اور ابھی چند قدموں کا فاصلہ تھا لیکن کتبے پہ لکھا نام واضح نظر آ رہا تھا اور نام پڑھتے ہی قدم ٹھٹک

گئے۔اس نے آنکھیں بھینچ کر دوبارہ کھولیں لیکن سب جوں کا توں تھا۔

''لامیہ.....'' اس کا اٹھتا قدم آواز پہ تھم گیا۔''آپ کو بڑی امی بلا رہی ہیں۔'' وہ نور العین تھی جس کی پھولتی سانسوں سے اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ بھاگتی ہوئی آئی تھی۔

اس نے ایک نظر سفید پتھروں پہ ڈالی، دوسری نظر نور العین کو دیکھا اور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس کے پیچھے چل دی۔جس ملازمہ نے پہلے روکا تھا وہ برآمدے میں کھڑی تھی۔اسے سارا معاملہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ کیوں اسے یہاں آنے سے روکا جا رہا تھا۔نور العین کی معیت میں چلتے ہوئے اس نے راستوں کو سمجھنے کی کوشش کی، وہ مزید بے خبر نہیں رہنا چاہتی تھی۔

''تمہاری مدراب کیسی ہیں؟'' خاموشی سے گھبرا کر اس نے سوال کر لیا۔

''بہت بہتر ہیں۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔''

''جی۔'' اسے نور کے لہجے میں خوشی محسوس نہیں ہوئی مگر مزید کچھ پوچھنا اچھا نہیں لگا۔

کئی راہداریاں مڑنے کے بعد ایک بڑا سا ہال سامنے تھا۔یہ وہی جگہ تھی جہاں وہ رات میں آئی تھی۔وہاں رات کی نسبتاً زیادہ لوگ موجود تھے۔وہ کتنے ہی لمحے سمجھ نہیں پائی کہ کیا ردعمل دے لیکن اس کی مشکل ودود کی والدہ نے آسان کر دی جنہوں نے اسے پکڑ کر اپنے ساتھ بٹھا لیا۔اسے بڑے سے بڑا ہجوم پریشان نہیں کرتا تھا لیکن ان چند لوگوں کی جانچتی نگاہیں کوفت زدہ کر رہی تھیں۔

''بیٹا! ان سے ملو یہ تمہارے نانا ہیں جنہیں سب بچے بڑے ابا کہتے ہیں۔بی جان سے تو رات میں مل چکی ہو نا۔'' شیماء نے تعارف کروانا شروع کیا تو وہ ہر چہرہ غور سے دیکھنے لگی۔

''میں تمہاری ممانی ہوں اور یہ تمہارے بڑے ماموں سعید ہیں۔'' اس نے خود سے فاصلے پہ بیٹھے انسان کو دیکھا جن کا تعارف ماموں کی حیثیت سے کروایا جا رہا تھا۔وہ اس حویلی کے پہلے مرد تھے جن کے چہرے پہ نرم تاثرات تھے۔

تعارف کا مرحلہ مکمل ہونے کے بعد ایک بار پھر سے خاموشی چھا گئی جیسے کوئی بھی سمجھ نہ پا رہا ہو کہ

گفتگو کا سرا کہاں سے تھاما جائے۔ لامیہ کو یہ خاموشی بھی بولتی ہوئی محسوس ہوئی کیونکہ وہاں موجود ہر انسان کے وجود سے بے چینی ٹپک رہی تھی، نگاہیں کچھ کہنا چاہ رہی تھیں مگر لبوں پہ موجود قفل توڑنا کسی کے لیے بھی آسان نہیں تھا۔

''تاشفین بھائی کیسے ہیں؟'' کتنے ہی لمحے گزر گئے کوئی نہیں بولا تو اس نے شیماء سے سوال کر لیا۔

''الحمدللہ بڑا خطرہ ٹل گیا ہے لیکن کل رات اس کے بہت عزیز دوست کی وفات ہوگئی اور یہ ہم سب کے لیے بہت بڑا جھٹکا تھا۔ ودود کل رات سے وہیں ہے اور بہت زیادہ پریشان بھی ہے۔ تاشفین کا دوست اس کے کافی قریب تھا۔'' انہوں نے اسے مکمل تفصیل بتائی تو صورتحال سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔

حویلی میں چھائی خاموشی اور سب کے اداس رویے اسے سمجھ آ رہے تھے لیکن اس کی نگاہیں بھٹک بھٹک کر بڑی امی کی جانب جا رہی تھیں۔ ان کی خاموشی کا مطلب سمجھنا مشکل تھا کیونکہ مجتبیٰ اور آنٹی سے ان کی بہت باتیں سن رکھی تھیں۔ وہ ماما کو بہت یاد کرتی تھیں مگر اب ان کا ردعمل باقی سب کی طرح سرسری تھا۔

''کوئی ماما کے متعلق کے بات کیوں نہیں کر رہا؟'' اس نے دل ہی دل میں سوچا۔

''سعید! میں نے اور تمہاری بی جان نے اس رشتے کو قبول کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ تاشفین کے گھر آتے ہی باقاعدہ ولیمہ کی تقریب ہو جائے گی۔'' وہ جو کب سے کچھ سننے کے لیے بے تاب اس لمحے گڑبڑا گئی۔

وہ اتنا بڑا فیصلہ اس سے پوچھے بنا کیسے کر سکتے تھے۔ اس نے فوراً انکار کرنا چاہا، انہیں اپنے رشتے کی نوعیت کا بتانا چاہا لیکن کچھ سوچ کر چپ کر گئی۔ ابھی اس کے پاس کچھ دن تھے اپنی جلد بازی سے وہ ماما کے لیے مزید مشکل پیدا نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''اور بیٹا تم..... تم اپنے والدین کو بلا سکتی ہو۔'' ان کا سرخ چہرہ اور بھینچے ہونٹ یہ بتانے کے لیے کافی تھے کہ انہوں نے کس مشکل سے یہ جملہ کہا تھا۔

اس کے بعد وہ فوراً وہاں سے اٹھ گئے لیکن لامیہ پہ شادی مرگ سی کیفیت طاری تھی۔ اس نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا کہ چند لمحے پہلے والی سوچ کو عملی جامہ پہنا نہیں دیا ورنہ یہ جملہ سننے کو نہ ملتا۔ یہ

سب اتنا آسان ہو سکتا تھا اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔

''چلو فوراً کلثوم کو فون کر کے یہ خوشخبری سناؤ۔'' شیماء ممانی کے لہجے سے بے تابی جھلک رہی تھی۔

''ماما سے رابطہ نہیں ہو پا رہا ورنہ میں ابھی انہیں کال کرتی۔'' وہ خود بے انتہا خوش تھی۔ پاکستان آنے کا یہ ہی تو مقصد تھا جو پورا ہو گیا۔

''کچھ دیر بعد بتا دے گی شیماء، کیوں اتنی اتاولی ہو رہی ہو۔'' سعید علی بھی شامل گفتگو ہوئے۔

''دراصل میں ماما کو بتا کر نہیں آئی تھی۔ یہ میرا اور پاپا کا سیکرٹ تھا، یہاں آنے کے بعد ماما سے بات نہیں ہو سکی اور اب تین دنوں سے سب کے نمبرز آف ہیں۔'' ممانی کا جوش دیکھ کر اس نے فوراً کال نہ کرنے کی وجہ بتائی۔

''مطلب اس نے خود اپنی مرضی تمہیں یہاں نہیں بھیجا؟ تم اس سے چھپ کر آئی ہو؟'' وہ جو سب ٹھیک ہو جانے پہ خوش ہو رہی تھی بڑی امی کے سوال پہ چونک گئی۔ انہیں شائد اس کی بات سن کر دکھ ہوا تھا۔

''ماما! نے کبھی میرے سامنے پاکستان اور اس سے منسلک کسی رشتے، کسی حوالے کا ذکر نہیں کیا کہ کہیں میں خود ترسی کا شکار نہ ہو جاؤں۔ اس لاتعلقی کی وجہ جان کر ان سے بدگمان ہو جاؤں گی یا آپ سب سے ملنے کا کہوں گی اور ایسا ان کے خیال میں ناممکن تھا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ آپ سب کو یاد نہیں کرتی تھیں۔ پاپا نے مجھے یہاں ماما کی وجہ سے بھیجا کیونکہ ماما کو سب خوشیاں دینے کے بعد بھی وہ ان کی آنکھ سے آپ کے نام کا آنسو مٹا نہیں پائے۔ ان کے دل سے اس حویلی کی یاد ختم نہیں کر سکے، انہیں راتوں کو چھپ چھپ کر رونے سے منع نہیں کر پائے۔ میں نے ماما کی ڈائری پڑھی ہے اس کے کسی صفحے پہ لامیہ یا ابراہیم کا ذکر نہیں تھا بلکہ ہر لفظ میں یہ حویلی تھی اس کے مکین تھے۔''

''تو پھر اس نے کبھی مڑ کر کیوں نہیں دیکھا۔ اسے اپنی ماں جی کا خیال نہ آیا .....'' وہ خاموش ہو گئیں لیکن اس کے بعد کی کہانی ان کے آنسو سنا رہے تھے۔ لامیہ فوراً اٹھ کر ان کے قریب آئی اور فرش پہ قدموں کے پاس بیٹھ گئی۔

''یہاں سے جانے کے بعد ان کی زندگی آسان نہیں رہی۔ پاپا کے تایا اسلم خان ان کی جان

کے دشمن بنے ہوئے تھے۔ پاپا نے آسٹریلوی ایمبسی سے مدد مانگی اور اسی دوران ان دونوں پہ حملہ کروا دیا گیا۔ ماما بہت مشکل سے بچ پائی لیکن ان کا بی بی زندہ نہیں رہا اور یہ صدمہ سہنا ان کے لیے آسان نہیں تھا۔ پاپا آپ سب سے رابطہ کرنا چاہتے تھے لیکن انہیں معلوم ہو گیا کہ یہاں ماما کو مار کر ان کی قبر بنوا دی گئی ہے۔ ماما کو مزید صدمہ نہ پہنچے اس لیے انہیں کہا کہ ان کے بھائی انہیں ڈھونڈ رہے ہیں اور وہ دونوں پاکستان چھوڑ گئے۔ پاپا اپنے تایا اور ماما نے اپنے بھائیوں کے ڈر کی وجہ سے کبھی واپس آنے کا نہیں سوچا بلکہ ماما کو تو ابھی تک یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ یہاں زندہ ہی نہیں ہیں انہیں تو مار کر دفنا دیا گیا ہے۔" لامیہ نے مختصر الفظوں میں ساری کہانی سنا ڈالی۔

"اسلم خان تمہارے پاپا کے تایا تھے؟" بڑی امی تو کچھ نہیں بولی لیکن سعید ماموں نے اچنبھے سے سوال کیا۔

لامیہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اپنے پاپا کو کہنا ان کا مجرم اپنے انجام کو پہنچ گیا ہے۔" سعید ماموں وہاں سے اٹھ کر چلے گئے لیکن لامیہ نے ان کی نم آنکھیں دیکھ لی تھیں۔

بڑی امی نے اسے اٹھا کر اپنے پہلو میں بٹھا لیا۔ وہ کلثوم کی باتیں سن رہی تھیں اور روتی جا رہی تھیں۔ شیما نے برف کو پگھلتے دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا اور ان دونوں کو اکیلا چھوڑ کر وہاں سے ہٹ گئیں۔ انہیں کھانے کی تیاری کرنی تھی اور سب سے بڑھ کر ودود کو ابا جان کے فیصلے کا بتانا تھا۔

☆.....☆.....☆

ضیغم چائے کے کپ ہاتھ میں لیے انتظار گاہ کی جانب آیا۔ وہ ودود کو یہاں چھوڑ کر گیا تھا اور اب وہ غائب تھا۔ چند لمحے متلاشی نگاہوں سے اردگرد دیکھا تو وہ دور سے آتا دکھائے دیا۔ اس کے ہاتھ میں کچھ فائلز تھیں اور چال میں عجلت پسندی۔

"کہاں چلے گئے تھے؟" وہ قریب پہنچا تو اسے چائے پکڑاتے ہوئے ضیغم نے پوچھا۔

"ڈاکٹر سے بھائی کے متعلق بات کرنی تھی۔ بھابھی کو ڈسچارج کر دیا گیا ہے ان کا فائنل چیک

اپ ہو رہا ہے۔'' اس کا لہجہ و انداز حد درجہ غمگین تھا۔ دکھ تو اسے بھی ہوا لیکن جو تعلق نبیل کے ساتھ ودود کا تھا ویسا اس کا نہیں تھا مگر ان چند دنوں کی بھاگ دوڑ نے انسیت پیدا کر دی تھی۔ رات اپنے ہاتھوں سے آخری رسومات کے لیے اسے اس کے لواحقین کے سپرد کیا تھا۔ ہزار کوشش کے باوجود وہ منظر بھلایا نہیں جا رہا تھا تو ودود کی کیا حالت ہوگی یہ سمجھنا آسان تھا۔

''تم مسلسل کئی دنوں سے یہاں ہو کچھ وقت کے لیے گھر چلے جاؤ۔'' ودود کو اس لمحے اس کی شدید فکر ہوئی۔ اس نے آدھی ذمہ داریوں کا بوجھ اس کے کندھوں سے ہٹا دیا تھا ورنہ وہ اکیلا کبھی سب محاذوں پہ پورا نہ اترتا۔ کئی دنوں کی بے آرامی اس کے چہرے سے واضح تھی اس لیے ودود نے اسے وہاں سے بھیجنا چاہا۔

''تم میری فکر نہ کرو آرام سے گھر جاؤ۔ یہاں قریب ہی یونیورسٹی فرینڈ کا فلیٹ ہے میں کچھ گھنٹے وہاں چلا جاؤں گا۔'' اس کو ودود کو تسلی دینا چاہی۔ وہ مطمئن ہوا یا نہیں مگر خاموش ہو گیا۔

''ودود! میں جانتا ہوں یہ بہت مشکل وقت ہے مگر تم نے سب کو سنبھالنا ہے اس لیے تمہیں ہمت نہیں ہارنی۔'' وہ خاموش، اداس بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

''پتا یار! تم جیسے دوست نصیب سے ملتے ہے۔ اچھے وقت کا ساتھی ہر کوئی ہوتا ہے اور کوئی لاکھوں میں ایک ہوتا ہے جو تکلیف میں کندھے سے کندھا ملا کر کھڑا ہو۔ تم نے مجھے اپنا مقروض بنا لیا ہے ساری عمر بھی یہ احسان اتارنے کی کوشش کروں تو اتار نہ پاؤں۔'' کبھی اپنے جذبات کا اظہار نہ کرنے والا اس لمحے اندرونی احساسات کو زبان دے رہا ہے۔ اس نے نم آنکھوں سے ضیغم کو گلے لگا لیا۔

''یہ احسان اور قرض کی باتیں میرے ساتھ کرتے ہوئے شرم تو نہیں آتی.....'' ضیغم نے آنکھوں میں آئی نمی چھپاتے ہوئے اس کے کندھے پہ ہلکی سی دھپ رسید کی۔

''اچھا میں چلتا ہوں کوئی بھی بات ہوئی فوراً مجھے کال کرنا۔ ابھی چچی جان کو لینا ہے اور حویلی میں کیا کیا طوفان آئے ہوں یہ بھی معلوم نہیں لیکن کل ضرور آؤں گا۔'' وہ اس کے بغل گیر ہونے کے بعد الگ ہوا اور زارا حسین کے روم کی جانب بڑھ گیا۔

ضیغم نے سنگی کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے ایک لمبی سانس خارج کی۔ انتہائی تکلیف دہ دن تھے لیکن گزر رہے تھے اور انسان سوائے اچھے وقت کی امید کے کچھ کر نہیں سکتا۔ ان چند دنوں میں جسمانی بھاگ دوڑ کے ساتھ دماغ ایک الگ رخ پہ سوچتا رہا۔ انسانی بے بسی اور قدرت کے سخت فیصلوں نے سوچوں کو الگ دھارے کی جانب موڑ رکھا تھا۔ وہ اپنی سوچوں میں مگن تھا کہ موبائل کی رنگ ٹون نے چونکا دیا۔ انجانا نمبر سکرین پہ چمکتا دیکھ کر چونک گیا لیکن فوراً موبائل کان سے لگا دیا۔

''السلام علیکم! کون.....'' دوسری جانب سے کوئی جواب نہیں آیا بلکہ دوسری جانب کی گہری خاموشی نے چھٹی حس بیدار کرنے میں لمحہ نہیں لگایا۔ وہ کال کاٹنے کا سوچ رہا تھا مگر اس پل سانسوں کی ہلچل نے متوجہ کر لیا۔ دوسری جانب کوئی تھا مگر کون.....

''یہ آپ ہیں؟'' اس نے کوئی نام نہیں لیا مگر نہ جانے کیوں اسے محسوس ہو رہا تھا کہ مقابل پہچانے جانے کی خواہش رکھتا ہے۔

''آپ سے مراد.....؟'' اس بار جواب آ گیا تھا۔ ضیغم کو اپنے اندازے کی پختگی پہ حیرانی ہوئی کیوں کہ دوسری جانب واقعی وہ تھی۔ یہ آواز وہ بھرے مجمع میں بھی پہچان سکتا تھا۔

''آپ جانتی ہیں میں آپ کا نام بہت احتیاط سے زبان پہ لاتا ہوں کہ کہیں کوئی غلطی آپ کے لیے مشکل نہ پیدا کر دے۔'' ضیغم کے چہرے پہ اس وقت الوہی سی چمک تھی۔

''مگر میری خواہش ہے اپنے نام سے پکارے جانا۔'' کیا ہی نرالی خواہش تھی اور دل یہ خواہش اس قدر اہتمام سے پوری کرنے کو مچل رہا تھا کہ ساری دنیا ہمہ تن گوش ہو جائے۔

''نور العین۔'' اس نے ایک جذب سے دھیمی آواز میں اسے پکارا۔

''جی.....'' وہ جو آنکھیں بند کیے اس ''جی'' کا لطف لے رہا تھا ایک دم ساکت ہو گیا۔ ودود کا چہرہ بند آنکھوں کے پردے پہ روشن ہوا تو آنکھیں بند رکھنا محال ہو گیا۔

''آپ پوچھیں گے نہیں کہ میں نے کال کیوں کی؟'' اس کی آواز نے سوچوں کا تانا کاٹا۔ وہ خود حیران تھا اس انہونی پہ مگر یقین کرنے میں لمحے ہی اتنے صرف ہو گئے کہ پوچھنے تک دیر ہو گئی۔ اب ودود

کا خیال آنے کے بعد کس منہ سے کچھ پوچھتا۔

''آپ خود ہی بتا دیں۔'' اپنے لہجے کی گرانی اسے دکھ دے رہی تھی۔ ایسے انمول لمحے اس سے پہلے خوابوں تک محدود تھے اور اب حقیقت میں مہربانی ہو رہی تھی تو وہ ہاتھ کھول کر وصول کرنے کی بجائے بھاگ رہا تھا۔

''پہلے آپ تو اندازہ لگائیے.....'' وہ اسے آزمانے پہ مصر تھی۔

''آپ کے لہجے کی کھنک میرے لیے نئی ہے۔'' نورالعین کا سوال تھا ضیغم پہ جواب دینا واجب تھا۔ وہ خوش تھی یہ اس کی سانسوں کی رفتار سے محسوس کر چکا تھا مگر وجہ معلوم نہیں تھی۔

''اگر دل کا موسم معلوم ہے تو وجہ بھی جانتے ہوں گے۔'' اس نے موبائل کان سے ہٹا کر حیرانی سے سکرین کو دیکھا۔ وہ اداس سی لڑکی بھلا ایسی باتیں کب کرتی تھی۔

وہ اس کی خوشی کی وجہ کیسے جان سکتا تھا۔ وہ اسی بات پہ خود کو ہواؤں میں اڑتا محسوس کر رہا تھا کہ نورالعین نے اپنی خوشی میں اسے یاد رکھا۔ وہ اپنی لاعلمی کا اظہار کرنے ہی لگا کہ اچانک ودود سے ہوئی گفتگو یاد آئی۔

''آپ کی والدہ آج گھر آ رہی ہیں۔'' اسے اپنے اندازے کی درستگی پہ پریقین تھا۔

''امی گھر آ رہی ہیں؟ آپ سے کس نے کہا؟'' وہ اس خبر سے مکمل لاعلم تھی۔

''ابھی کچھ دیر پہلے ودود نے بتایا۔''

''مجھے علم نہیں تھا۔'' ضیغم حیران ہوا کیونکہ دوسری جانب سے آنے والی آواز مدھم پڑ گئی تھی۔ اگر اسے علم نہیں تھا تو وہ خوش کس بات پہ تھی۔

''آپ نے اپنی خوشی کی وجہ نہیں بتائی؟'' تجسس بڑھنے لگا تھا۔

''ودود بھائی کے نکاح کو بڑے ابا نے تسلیم کر لیا ہے۔'' یہ خبر واقعی حیران کن تھی۔ ضیغم کے چہرے پہ مسکراہٹ پھیلنے لگی، دل میں دوست سے دھوکہ کرنے کی خلش قدرے کم ہونے لگی تھی۔ ایک سکون تھا جو اس کے وجود میں اترا تھا۔ ودود کے رشتے کو تسلیم کرنے کا مطلب تھا کہ نورالعین ایک ان چاہے رشتے سے آزاد

تھی۔ان کی منزل ابھی بھی دور تھی شائد ناممکنات کے قریب لیکن وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ودود کا حق غصب کرنے جیسی سوچوں سے چھٹکارا مل گیا تھا۔اب ہجر و وصال کی کہانی نصیب کے دسترس میں تھی لیکن اسے محبت کیے جانے کی آزادی مل گئی تھی۔کئی تکلیف دہ دنوں کے بعد یہ حسین پر کیف لمحے تھے۔

''آپ چپ کیوں ہو گئے؟''اس کی طویل خاموشی سے وہ گھبرا گئی۔

''میں آپ کو بتا نہیں سکتا نور العین آپ نے مجھے کس بوجھ سے آزاد کر ڈالا۔خود کو آپ کی محبت سے روکنا ماہی بے آب جیسا تھا، ہر کوشش بے سود تھی، ہر حربہ ناکام تھا۔دوستی کا تقاضا الگ وجود کو گھن کی مانند چاٹ رہا تھا۔میرا وجود دو حصوں میں بٹا ہوا تھا ایک حصہ آپ کے نام کی دہائی لگا رہا تھا، دل زندگی سے محبت پہ اکسا رہا تھا اور دوسرا حصہ دوست پہ نثار ہوا جا رہا تھا۔وہ مرنے مٹنے پہ آمادہ تھا مگر دوست کی پیٹھ پہ خنجر گھونپنے کو تیار نہیں تھا۔آج آپ نے مجھے اس مشکل سے نکال دیا۔میں اسے اپنی خوش قسمتی کہوں گا کہ مجھے آپ کو چاہے جانے کی اجازت دے دی گئی ہے۔مجھ پہ یہ عنایت کر دی گئی ہے کہ کوسوں دور رہ کر دل آپ کے نام پہ دھڑکتا رہے، نگاہیں آپ کے خیال سے سیراب رہیں اور تصور آپ کے عکس سے آباد رہے۔''وہ ایک جذب سے بولتا ہوا اپنے آپ میں مگن تھا کیونکہ جس نے تکلیف جھیلی ہو اس کے ازالے کی قیمت سے وہی واقف ہو سکتا ہے۔اسے ایک دم دوسری جانب کی خاموشی محسوس ہوئی تو چپ کر گیا۔

''شائد میں کچھ زیادہ بول گیا۔''وہ واقعی زیادہ بول گیا تھا۔نگاہوں کے سلسلے میں دفعتاً ایسا اقرار محبوب کی سانسیں تھام لینے پہ مکمل قادر ہوتا ہے۔

''آپ رو رہی ہیں نور العین.....''کئی لمحوں بعد احساس ہوا کہ وہ رو رہی تھی۔

''کیا نہیں رونا چاہیے.....''پھر سے سوال..... ضیغم کو پہلی بار معلوم ہوا کہ وہ کس قدر زیادہ سوال کرتی تھی۔

''آپ کو میری کوئی بات بری لگی؟''ایک اور اندازہ لگایا تھا۔

''نہیں.....''

''پھر ان آنسوؤں کا سبب؟''

''مجھے یقین نہیں آ رہا ضیغم۔ اس دنیا میں بڑی امی کے علاوہ بھی کسی کو نورالعین عزیز ہو سکتی ہے.....اور اتنی عزیز کہ اسے بھولنا اپنے ہاتھوں سے خود کو مارنے جیسا لگے.....''

''آپ چاہے جانے کے قابل ہیں نورالعین۔'' اس کی محبت سیپ میں بند موتی کی مانند سنبھال لی گئی تھی اور یہ کتنا فرحت بخش احساس تھا۔

''ٹھہریں! میں خود کو چٹکی کاٹ کر دیکھ لو.....'' اگلے ہی پل سی کی آواز آئی تو ضیغم اس کے بھولے پن پہ مسکرا دیا۔

''کیسا لگا.....'' اب لہجے میں شرارت تھی۔

''یہ حقیقت ہے ضیغم۔ میں خواب نہیں دیکھ رہی یا شائد کھلی آنکھوں سے خواب دیکھنے لگی ہوں۔ کس خواب کی تعبیر سچی ہوتی ہے بتائیں ذرا تاکہ میں اپنا خواب ویسا سمجھوں۔''

''کھلی آنکھ کا خواب کیونکہ اس کا حقیقت سے تعلق زیادہ ہوتا ہے۔''

''تو بس یہ وہی خواب ہے۔'' ضیغم کا قہقہہ جگہ کی مناسبت سے بے نیاز تھا۔

''آپ بھی نا نورالعین.....'' وہ کتنے ہی لمحے مسکراتا رہا۔ مسکراہٹ تب سمٹی جب دوسری جانب سے کوئی آواز نہ آئی۔ کال کٹ چکی تھی۔

تو نے کبھی دیکھی ہے وہ پیشانی، وہ رخسار، وہ ہونٹ
زندگی جن کے تصور میں لٹا دی ہم نے
تجھ پہ اٹھی ہیں وہ کھوئی ہوئی ساحر آنکھیں
تجھ کو معلوم ہے کیوں عمر گنوا دی ہم نے

بند آنکھوں میں نورالعین کا چہرہ بسائے زیرِ لب کہیں پرانا پڑھا ہوا شعر دہراتے ہوئے وہ کسی کی نگاہوں سے مکمل انجان تھا۔ وہ انجان ہی رہا کہ کوئی اسے کتنے ہی لمحوں سے دیکھ اور سن رہا تھا اور اس کی محویت کی گہرائی دیکھنے کے بعد کوئی دھیمے قدموں سے واپس پلٹ گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

سہ پہر ڈھل رہی تھی۔ شہر کے وسط میں موجود عمارت میں کام کرنے والوں کے چہرے سے دن بھر کی تھکن عیاں تھی۔ ہر ایک کے کام کرنے کی رفتار سست تھی۔ کوئی کمپیوٹر سکرین پہ وقت کی چال دیکھ رہا تھا، کوئی موبائل سکرین پہ اور کسی کی نظر کلائی پہ بندھی گھڑی پہ تھی۔ سب کام کے اوقات ختم ہونے کے منتظر تھے۔ اس پر ہجوم حصے سے پرے ودود کا آفس تھا جس کے ایک کونے میں رکھی میز کے پیچھے عزت بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ آدھا دن گزر جانے کے بعد آفس آتی تھی اس لیے اس کے چہرے پہ باقی لوگوں جیسی تھکن نہیں تھی البتہ عجلت بے تحاشا تھی۔ وہ جلد از جلد کام ختم کرنے کی کوششوں میں تھی۔ ودود کی غیر حاضری کے بعد وہ سعید سر کو رپورٹ کر رہی تھی اس لیے اس کی کوشش ہوتی کہ غلطی کی گنجائش نہ ہو۔ آج اس نے وقت سے پہلے آفس سے نکلنا تھا اس لیے وہ کچھ زیادہ دل جمعی سے کام کر رہی تھی۔ اس کی فائل تقریباً تیار تھی جب اسے بلایا گیا۔ اس نے جلدی سے ساری فائلز اکٹھی کیں، دوپٹہ سر پہ ٹکایا اور آفس سے باہر نکل آئی۔

سعید علی چٹھہ کا آفس قدرے فاصلے پہ تھا۔ وہ جیسے ہی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی وہ اپنے ہی منتظر لگے۔ اس نے فائلز ان کے سامنے رکھنے کے ساتھ یو ایس بی کمپیوٹر سے اٹیچ کی اور پروجیکٹ کی مکمل تفصیل انہیں بتانے لگی۔

"واؤ مس عزت! آپ بہت اچھے طریقے سے یہ پروجیکٹ ہینڈل کر رہی ہیں۔" وہ اس کے کام سے کافی متاثر ہوئے تھے۔ عزت چند روز سے ان کے ماتحت تھی اور وہ اس کی تخلیقی صلاحیتوں کے قائل ہو رہے تھے۔ ودود کا انتخاب بے انتہا درست تھا۔

"تھینک یو سر لیکن اس میں میرا کمال نہیں ہے۔ یہ ودود سر کی گائیڈنیس اور ٹیم ورک کا نتیجہ ہے۔"

"او کے۔ آپ اس پروجیکٹ کے ہولز پہ دوبارہ کام کریں اور پھر میٹنگ میں یہ پروجیکٹ سب کے سامنے رکھتے ہیں۔ مجھے یقین ہے آپ کی ٹیم یہ ٹاسک اچیو کر لے گی۔" ان کا انداز کافی حوصلہ افزا تھا۔

اس نے مناسب وقت دیکھتے ہوئے ان سے جلدی جانے کی اجازت مانگی اور بنا کسی مشکل کے اجازت مل گئی۔ وہ ان سے ودود کا پوچھنا چاہتی تھی کیونکہ اس کو فائنل ورک چیک کروائے بنا میٹنگ میں

نہیں جانا چاہتی تھی لیکن اس کا جملہ منہ میں ہی رہ گیا۔ کوئی بہت زور سے دروازہ کھولتے ہوئے آفس میں داخل ہوا۔ اس نے آنے والے کو دیکھا تو چہرے پہ ناگواری بکھر گئی۔ اس کی ممکن حد تک کوشش ہوتی تھی اس انسان سے فاصلہ قائم رکھنے کی مگر کئی بار ناکامی ہوتی تھی۔

''اے لڑکی! باہر جاؤ۔'' وہ ہمیشہ کی طرح ہتک آمیز انداز لیے ہوئے تھے۔

''سوری سر! میں آپ سے پہلے موجود ہوں اور میرا کام نہایت ضروری ہے۔ آپ میرے جانے کا انتظار کیجیے۔'' اس کے جواب نے ماحول میں عجیب سی تلخی پیدا کر دی تھی۔ اس کا کام ختم ہو چکا تھا مگر اس انسان کو دیکھ کر نہ جانے غصہ عود کر آتا تھا اسی لیے اس نے کام کا بہانہ لگایا۔

''سنا نہیں تم نے باہر جاؤ۔'' اس بار دھاڑنے کے ساتھ انہوں نے عزت کو ہاتھ سے پیچھے دھکیلا تھا۔

''عزت! آپ پلیز باہر ویٹ کیجیے۔'' معاملہ بگڑتا دیکھ کر سعید علی کو مداخلت کرنی پڑی تھی۔

''سر یہ اس سے پہلے کئی بار میرے ساتھ ایسا کر چکے ہیں۔'' یہ دوسری بار تھا مگر اس نے جان بوجھ کر کئی کا لفظ استعمال کیا۔ ''میں یہاں جاب کرنے آتی ہوں اپنی عزت نفس بیچنے نہیں اس لیے انہیں اپنے رویے پہ نظر ثانی کرنے کا کہیں کیونکہ میں ایسے ماحول میں کام نہیں کر سکتی۔'' اس کے چہرے کے عضلات تن گئے اور لہجہ بھی حد درجہ کرخت تھا۔

''ہاں تو نکلو یہاں سے۔ پتا نہیں کہاں سے آ جاتے ہیں دو ٹکے کے لوگ۔'' سعید علی حیرانی سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ سعد کی ایسی حرکات کی وجہ سے انہیں کئی بار شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ وہ عزت کو جانے کے لیے کہنے ہی والے تھے کہ وہ آفس سے باہر نکل گئی۔

''سعد یہ کیا حرکت تھی؟ کیوں ملازمین کے سامنے ہمارا تماشہ بنا رہے ہو؟''

''تماشا تم سب میرا بنا رہے ہو۔ بینک اکاؤنٹس بند کرنے کے ساتھ ساتھ کیا مجھے کمپنی سے بھی نکالا جائے گا؟'' وہ آج کئی دنوں بعد آفس آئے تھے لیکن اپنے آفس کو لاک دیکھ کر انہیں شدید غصہ آیا اور اسی سبب وہ یہاں کھڑے تھے۔

''اسی خدشے کے سبب میں نے تمہیں کئی بار منع کیا، کئی بار تنبیہہ کی مگر تم کسی کی مانتے کب ہو۔

اب یہ تمہارا اور ابا جی کا معاملہ ہے مجھے اس سے الگ رکھو۔" انہوں نے اپنا موقف واضح کر دیا۔

ان کا انکار مقابل کو پاگل کر گیا وہ بنا کچھ سوچے سمجھے کتنی ہی دیر بولتے چلے گئے۔ ابا جان کی نا انصافیوں کا پلندہ جمع تھان کے پاس جسے سعید علی خاموشی سے سن رہے تھے۔ وہ خود ہی بول بول کر تھک گئے تو وہاں سے چلے گئے۔ بھائی کے جانے بعد کتنی دیر وہ گہری سوچ میں گم رہے۔ وہ آج تک اسے مکمل سمجھ نہیں پائے تھے نہ جانے اس کے ذہن میں کون سی کج تھی جو اسے در در بھٹکائے پھرتی تھی۔ اس کے ذہن میں کیا چلتا، وہ کیا سوچتا کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ اس نے اپنی کیفیت کبھی کسی پہ عیاں کی اور نہ کسی کو اپنی ذات کے دائرے میں گھسنے کی اجازت تھی۔ وہ آج بھی اس چھوٹے بچے کی مانند تھا جو والدین کے روکنے پہ بھی پاؤں پاؤں چلنے کی کوشش میں چوٹ لگوا بیٹھتا ہے۔ وہ لاکھ کوشش کے باوجود اس کی سوچ تک رسائی حاصل نہیں کر پائے، وہ ایک انتہائی مشکل انسان تھا۔ سعد کو گئے چند لمحے ہی ہوئے تھے جب ودود کی سیکرٹری عجلت میں آتی دکھائی دی۔

"کیا ہوا مس فریحہ؟" انہوں نے سوالیہ نگاہوں سے آنے والی کو دیکھا۔

"سر! عزت Resignation Letter دے کر گئی ہیں۔" مس فریحہ کے جاتے ہی انہوں نے سر تھام لیا۔ انہیں عزت کے ریزائن سے کوئی پریشانی نہیں تھی بلکہ ودود کے ردعمل کا خوف تھا۔ وہ جتنا ان دونوں کے درمیان فاصلہ قائم کرنا چاہتے تھے اتنا ہی کوئی نا کوئی مسئلہ پیدا ہو جاتا تھا۔ اس مشکل کا حل سوچتے ہوئے نظریں دوبارہ لیپ ٹاپ سکرین پہ ٹکا دیں۔

☆.....☆.....☆

کافی شاپ میں زیادہ رش نہیں تھا۔ ہال میں کونے والی میز پہ مجتبیٰ پچھلے بیس منٹ سے بیٹھا منتظر نگاہوں سے دیوار میں نصیب شیشوں سے باہر کی جانب دیکھ رہا تھا۔ عزت نے اسے ملنے کے لیے بلایا اور وہ شاداں فرحاں چلا آیا تھا۔ یہ کافی شاپ گھر کے بالکل قریب تھی لیکن پھر بھی ماما نے گارڈ کے بنا آنے کی اجازت نہیں تھی۔ یہ جگہ عزت کے لیے کافی دور تھی مگر اس نے بنا کوئی عذر کیے آنے کا عندیہ دے دیا تھا۔ اس نے پانچ بجے آنے کا کہا تھا اور اب بیس منٹ اوپر ہو چکے تھے۔ وہ اسے کال کرنے کا

سوچ رہا تھا کہ تبھی وہ شاپ کا دروازہ کھول کر اندر آتی دکھائی دی۔اس نے ہمیشہ کی طرح بڑی سیاہ چادر سے خود کو لپیٹا ہوا تھا۔

''سوری مجھے آنے میں دیر ہوگئی۔'' مجتبیٰ کے مقابل بیٹھتے ہوئے اس نے فوراً معذرت کی۔

''زیادہ نہیں بس 20 منٹ لیٹ تھی وہ الگ بات کہ مجھ سے یہ وقت گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔'' اس سے ملنے کی بے چینی کا کس قدر سادہ اعتراف تھا۔

''یہ تمہارے لیے.....'' مجتبیٰ نے اپنے پہلو میں رکھا گلدستہ میز پہ عزت کے سامنے رکھ دیا۔

''یہ کس لیے؟'' وہ گلاب کی خوشبو سے مہکتا گلدستہ دیکھ کر بے انتہا متاثر ہوئی تھی۔ ہاتھ بڑھا کر گلدستہ تھاما اور منہ کے قریب لے جا کر گہری سانس لیتے ہوئے ساری خوشبو خود میں اتار لی۔ وجود میں چلتی ساری الجھنیں ایک پل کو اڑن چھو ہوگئی تھیں۔

''اتنے عرصے بعد مل رہے ہیں ویسے بھی ہم دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ اتنے مہینے ہوگئے کبھی کوئی پر لطف موقع ہاتھ ہی نہیں آیا۔کوئی ایسا پل نہیں ملا جو تم تک میرے جذبات پہنچا سکے۔حالات نہ جانے کیا سے کیا ہوتے گئے اور ان سب میں ایسا پھنس گیا کہ تمہیں بتا نہیں سکا تم میرے لیے کتنی خاص ہو۔'' یہ پہلا موقع تھا جب وہ عزت کی آنکھوں میں اترنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''اس کے لیے شکریہ۔'' اس نے آنکھیں چراتے ہوئے شکریہ کہا۔مجتبیٰ کی باتوں نے اسے یہاں آنے کا مقصد چند لمحوں کے لیے بھلا دیا۔

''تمہیں بتاؤں عزت میں اس سارے وقت کو بہت خاص بنانا چاہتا تھا۔تمہیں پانے سے اپنانے تک جتنا بھی وقت لگ جاتا، چاہے کئی سال مگر اسے میں ہم دونوں کے لیے یادگار بنانے کی خواہش رکھتا تھا۔تمہاری صبح میری یاد سے ہو تمہاری رات میری بات سے مگر میں ایسا کچھ نہیں کر پایا۔اب یہ ملاقات مجھے اپنی ناکام خواہشوں کا ربط لگی تو میں نے اسے ضائع نہ کرنے کا سوچ لیا تھا۔'' وہ جیکٹ کی جیب سے مخملی ڈبیا نکال رہا تھا۔

عزت نے اسے منع کرنا چاہا لیک اس کے چہرے پہ پھیلے محبت کے رنگوں نے لبوں کو جیسے قفل لگا

دیے۔ وہ بے چینی سے بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں پہنی انگوٹھی کو مسل رہی تھی۔ اس کے وجود میں بے بسی کے جالے پھیلنے لگتے تھے وہ یہاں کیا سوچ کر آئی تھی اور مقابل کیا کیے جا رہا تھا۔ وہ اس کے لیے واپسی کا سفر مشکل بنا رہا تھا۔

''کچھ عرصہ پہلے ہم فیملی ٹرپ پہ دبئی گئے تھے وہاں یہ رنگ مجھے بہت پسند آئی اور میں نے خرید بھی لی یہ جانے بنا کہ یہ کس ہاتھ کی زینت بنے گی۔ پہلے ماما نے تمہیں اپنی خاندانی رنگ پہنا دی اور مجھے یہ دینے کا موقع نہیں ملا۔'' وہ ہاتھ آگے کیے اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا اور وہ بھاگنے کے سب راستے بند ہوتے دیکھ رہی تھی۔

''مجتبیٰ! مجھے تم سے بات کرنی تھی۔'' اس نے ہمت کرتے ہوئے بولنے کی کوشش کی۔

''اور مجھے پہلے یہ رنگ پہنانی ہیں اس لیے فوراً ہاتھ آگے کرو۔'' آج نہ جانے اس کے لہجے میں یہ دھونس کہاں سے پیدا ہو گئی تھی عزت نے تو اپنے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں کی تھی۔

اس نے فرار کی کوئی راہ نہ دیکھتے ہوئے ہاتھ آگے کر دیا۔ سفید نگینوں سے مزین بے انتہا خوبصورت انگوٹھی اس کی انگلی میں پہنائی گئی تو وہ کتنے ہی لمحے محویت سے اسے تکتی رہی۔ مجتبیٰ کی آنکھوں میں ان نگینوں جیسی چمک تھی۔

''ایسا لگ رہا جیسے تمہارے لیے ہی بنی ہے۔'' مجتبیٰ اس کے ہاتھ کو ابھی تک گرفت میں لیے ہوئے تھا۔

اس کی محویت ختم ہونے میں کافی دیر لگی اور یہ چند لمحے ارادوں پہ بری طرح حاوی ہوئے تھے۔ اس کی شدت پسندی پہ جیسے اوس گرا دی گئی تھی۔ اس لمحے ادراک ہوا کہ مضبوط فولادی جذبات پیار کے دو بول بولنے پہ بھربھری ریت کی دیوار بن کر ڈھے جاتے ہیں۔ ہر مصلحت، ہر فیصلے پہ میٹھی نظر دھاوا بول دیتی ہے۔

''اب بتاؤ کیا بات کرنی تھی۔'' اس کے ہاتھ کو جی بھر کے دیکھنے کے بعد وہ اس کی جانب متوجہ ہوا مگر گرفت ابھی بھی باقی تھی۔

''مجھے تمہیں اپنے متعلق بتانا ہے۔'' اس نے سوچ سمجھ کر بولنا شروع کیا لیکن چند لمحے پہلے جو ہوا

اس نے آنکھوں میں خوف کے سائے پیدا کر دیے تھے۔ وہ سہمی نگاہوں سے اس کے ہاتھ میں قید اپنے ہاتھ کو دیکھ رہی تھی جس کا کسی بھی لمحے چھوٹنے کا خطرہ تھا۔

''تمہارے متعلق میں سب جانتا ہوں عزت۔'' اس کے اطمینان میں فرق نہیں پڑا۔

''نہیں..... میرا مطلب مجھے اپنے والدین، اپنے خاندان کے حوالے سے بات کرنی ہے۔''

''اور میں یہ سب جان کر کیا کروں گا۔'' اس کی آنکھیں نے عزت کا چہرہ قید کیا۔

''ہم ایک رشتے میں بندھنے والے ہیں مجتبیٰ تمہیں میرے متعلق سب معلوم ہونا چاہیے اس سے پہلے کوئی دوسرا بتائے اور تب تک بہت دیر ہو چکی ہو۔''

''مجھے ایسی باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میرے لیے کچھ خاص ہے تو وہ تمہاری محبت ہے۔ میرے لیے تمہارے پرخلوص جذبوں سے آگاہی کافی ہے۔''

''اور اگر تم بعد میں کبھی پچھتائے تو.....؟''

''مجھے تمہاری وفا سے زیادہ کچھ نہیں چاہیے عزت اس لیے پچھتانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

''پھر کہوں گی میری بات سن لو۔''

''مجھے نہیں سننی۔''

''سوچ لو.....؟''

''سوچ لیا.....''

وہ دل پہ پتھر رکھے بے حال ہوئے جا رہی تھی اور وہ مطمئن ہر بات سے بے نیاز اس کی کسی بات پہ دھیان نہیں دھر رہا تھا۔ اس کے انکار نے خوف کے سائے مدھم کر دیے تھے لیکن اطمینان ابھی بھی کہیں گم تھا۔ وہ شدت سے چاہتی تھی مجتبیٰ کو نازنین کا علم ہو، وہ جان لے اس کے سامنے سعد علی چٹھہ کی بیٹی بیٹھی ہے لیکن وہ انجان رہنے پہ آمادہ تھا۔ اس کی سب کوششیں ناکام گئیں تو مزید جدوجہد بے کار تھی۔

''ٹھیک ہے مجتبیٰ اب تمہیں وقت بتائے گا کہ مجھ سے تمہارا کوئی اور بھی رشتہ ہے۔ ہمارا ملنا نصیب کی سازش تھی تو سب اسے ہاتھ میں سونپتے ہیں اور ہم چپ بیٹھے تماشہ دیکھتے ہیں۔'' اس نے دل

ہی دل میں اسے مخاطب کیا۔اس نے مجتبیٰ کے ہاتھ پہ اپنا دوسرا ہاتھ رکھ دیا اور بھینچے ہونٹوں کی ملاقات مسکراہٹ سے کروائی۔

موبائل سکرین پہ حازم شفیق کا نمبر جل بجھ رہا تھا۔آج ان کی مہندی تھی اور وہ بالکل نہیں جانا چاہتی تھی۔کنزی کے بار بار بلانے کے باوجود اس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔اس نے موبائل پاور آف کر کے بیگ میں ڈال دیا اور مجتبیٰ کے سنگ کافی کے کڑوے پن کا لطف لینے لگی۔

☆.....☆.....☆

ابراہیم خان درانی اور زبیر احمد حویلی کے مہمان خانہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ابراہیم کچھ دیر پہلے ہی اندرونی حصے میں آئے کیونکہ اب افسوس کرنے کے لیے آنے والوں کی تعداد ختم ہوگئی اور حویلی کا دروازہ بند کر دیا گیا تھا۔ان کے چہرے پہ چھایا حزن زبیر احمد واضح محسوس کر رہے تھے۔

''کبھی سوچا بھی نہیں تھا ایسے موقع پہ ملاقات ہوگی۔'' زبیر کی بات پہ وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگے۔سالوں بعد ملاقات ہو رہی تھی زندگی کا بڑا حصہ گزر چکا تھا شائد یہ ہی وجہ تھی کہ گفتگو شروع کرنے کے لیے تمہید باندھنی پڑ رہی تھی وگرنہ ایک وقت تھا وقت ختم ہو جاتا مگر باتیں کبھی ختم ہی نہیں ہوتی تھیں۔

کلثوم بھی عائشہ کو سلا کر وہیں چلی آئیں اور ابراہیم کے ساتھ صوفے پہ بیٹھ گئیں۔

''سو گئیں بھابھی۔'' ابراہیم کے پوچھنے پہ انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''بہت بری حالت ہے ان کی، بہت مشکل سے سوئی ہیں۔'' کلثوم کی آنکھیں سرخ اور لہجہ آزردہ تھا۔

''دکھ بھی تو بہت بڑا ہے۔مجھے تو سمجھ نہیں آتی وہ خود کو کیسے سنبھالیں گی۔'' زبیر احمد کی نگاہوں میں ہسپتال میں ہونے والی ملاقات گردش کر رہی تھی وہ کس قدر پر امید تھیں۔ایسے سانحے کا سوچا بھی نہیں تھا۔

''زبیر بھائی! لامیہ کیسی ہے؟'' کلثوم اس سے زیادہ صبر نہیں کر سکتی تھیں۔

''ٹھیک ہے۔'' انہیں اسی لمحے کا خوف تھا وہ خود کو اگلے سوالات کے لیے تیار کر رہے تھے۔

''اور بچیا.....؟''

''وہ بھی ٹھیک ہیں۔'' انہوں نے رقیہ کو کلثوم کی آمد کا نہیں بتایا تھا۔

''آپ لامیہ کو ساتھ لے آتے خیر کوئی بات نہیں کل لے آیئے گا۔ میں کبھی اتنے دن اس کے بغیر رہی نہیں نا تو اس لیے بہت اداس ہو گئی ہوں۔ یہ موقع بھی ایسا ہے تو اسے ہمارے ساتھ اپنے گھر میں ہونا چاہیے۔'' وہ ان کے منہ سے یہ سننے کے لیے بے چین ہو رہی تھیں کہ وہ کل لامیہ کو لے آئیں گے۔

''لامیہ اپنے گھر میں ہی ہیں۔'' وہ کتنی دیر تک چھپا سکتے تھے اس لیے نپے تلے الفاظ میں بتانا شروع کیا۔ انہوں نے لامیہ کی آمد سے لے کر سفید حویلی جانے تک سب بتا دیا۔

''آپ نے ہمارے بغیر اتنا بڑا فیصلہ کیسے کر لیا؟ ہم سے پوچھ تو لیتے۔ وہ اذلان کو پسند کرتی ہے اور آپ نے اس کا نکاح ایک انجان شخص سے کر دیا بلکہ اسے وہاں بھیج بھی دیا۔ وہاں اس کے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہوگا یہ جان کر کہ وہ میری بیٹی ہے۔'' وہ زار و زار رونے لگی تھیں۔ اپنے خدشات اور وسوسے اس لمحے حقیقت محسوس ہو رہے تھے۔

''ابراہیم! اسے فون کریں بلکہ نہیں ابھی اٹھیں اسے لینے چلتے ہیں۔ میری بچی نہ جانے کس حال میں ہوگی۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور اب ابراہیم کو ہاتھ سے پکڑ کر اٹھا رہی تھیں۔ ابراہیم خود اچھے خاصے سکتے کا شکار تھے۔ ان کے وہم و گمان میں نہیں تھا کہ ایسا کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

''آپ بے فکر رہیں وہ ٹھیک ہوگی۔ وہاں اسے کوئی گزند نہیں پہنچے گا یہ میں گارنٹی دیتا ہوں۔''

''جنہوں نے سگی بیٹی کو مارنے سے گریز نہیں کیا وہ اس کے ساتھ کیا کر رہے ہوں گے۔'' وہ کسی طریقے سے مطمئن نہیں ہو رہی تھیں۔

''وہ پرانی بات تھی کلثوم اب ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ ودود اس کے ساتھ ہے وہ اسے کانٹا تک چبھنے نہیں دے گا۔'' ان کے لیے کلثوم کو مطمئن کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

''ودود وہی ہے نا جو نبیل کو قبر میں اتارنے کے لیے ساتھ تھا؟''

''جی وہی ہے۔ وہ بہت باہمت لڑکا ہے ابراہیم۔ ایک وہی ہے جو کلثوم کو واپس اس حویلی میں لے کر جا سکتا ہے، جو لامیہ کی حثیت تسلیم کروا سکتا ہے اور جسے اس کی حقیقت سے بھی کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔

میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے تم لوگ مجھ پہ بھروسہ تو کرو۔ میں اس کا دشمن نہیں ہوں۔" وہ لامیہ کے حوالے سے یہ بات نہیں کرنا چاہتے تھے لیکن انہیں حالات کی نوعیت سمجھانے کے لیے کرنی پڑی۔

"وہ سفید حویلی کا ہی خون ہے ابراہیم۔ میں نے سعد کو ایک بچی کے ساتھ یتیم خانے میں دیکھ لیا تھا۔ وہ عمارت کے باہر بچی رکھ کر فرار ہو گیا تھا۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آئی تو میں نے وہ بچی اٹھا کر تمہیں لا دی کیونکہ اس وقت کلثوم کی حالت بہت خراب تھی۔ میں چاہتا تو خود پال سکتا تھا یا سفید حویلی چلا جاتا لیکن اس بچی کے بہتر مستقبل کے لیے تمہارے حوالے کر دیا اور یقین کرو آج بھی سب اس کی بھلائی کے لیے کیا ہے۔ وہ اپنے خاندان میں واپس چلی گئی ہے اور جلد میں اس کی ماں بھی ڈھونڈ لوں گا۔" ساری حقیقت جاننے کے بعد ابراہیم مطمئن ہو گئے لیکن کلثوم کے آنسو تھم نہیں رہے تھے۔ انہیں نہ جانے کون کون سے غم رلا رہے تھے۔ آج طیبہ حیدر کے طعنے کسی نشتر کی طرح درد دے رہے تھے۔ وہ اپنوں سے کٹ کر بھی جدا نہیں تھیں ان کی گود میں اپنے بھائی کی اولاد تھی وہ بھائی جو انہیں زندہ جلا دینا چاہتا تھا۔

"تمہاری سب باتیں ٹھیک ہیں زبیر لیکن ایک ماں اپنی بیٹی سے ملنے کے لیے بے چین ہے۔ تم کسی طرح لامیہ کو یہاں بلوا لو کلثوم خود ملے گی تو مطمئن ہو جائیں گی۔" ان سے بیوی کو روتے ہوئے دیکھنا ہمیشہ مشکل تھا۔

"میری مانو تو ابھی رک جاؤ، اس سے ملاقات نہ کرو۔ وہ بہت مشکل سے وہاں گئی تھی اسے نیا رشتہ تسلیم کرنے اور وہاں اپنی جگہ بنانے کے لیے کچھ وقت چاہیے ہو گا تم لوگوں کو دیکھ کر وہ ایسی کوئی بھی کوشش نہیں کرے گی، فوراً سے پہلے واپس پلٹ آئے گی۔ وہ نادان ہیں اتنی تلخ حقیقتوں سے آگاہ نہیں ہے لیکن ہم تو جانتے ہیں نا..... اسے اپنا نقصان کرنے نہیں دے سکتے۔ خود کوئی بھی تکلیف سہہ سکتے ہیں لیکن اسے ہنستا مسکراتا دیکھنا چاہتے ہیں۔ تم میرا یقین کرو ابراہیم ایک بار لامیہ کو حویلی اور ودود کو تسلیم کر لینے دو وہ لڑکا اسے سمیٹ لے گا۔" ان کے لہجے کا خلوص کلثوم کے دل کو چھونے لگا تھا تبھی آنسوؤں کی روانی میں کمی آ گئی تھی۔

دل کو جیسے ہی کچھ سکون ہوا دماغ واقعے کی جزئیات کو گہرائی سے سوچنے لگا۔ طیبہ حیدر نے لامیہ

کے وجود کو سوالیہ نشان بنا دیا تھا ، لامیہ کی تڑپ میں وہ خود بھی بہت اذیت میں تھیں لیکن ابھی ہونے والے انکشاف بے انتہا مطمئن کر رہے تھے۔ وہ کوئی عام بچی نہیں تھی ان کا خون تھی، سفید حویلی کا حصہ تھی اور جو اپنائیت، توجہ اور حق اسے وہاں مل سکتا تھا وہ دنیا کے کسی دوسرے کونے میں میسر نہیں ہو سکتا تھا۔ انہوں نے پرسکون ہو کر سوچا تو زبیر احمد کی دور اندیشی کی قائل ہونے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں زبیر بھائی والدین کے لیے اولاد کی بہتری اولین ترجیح ہوتی ہے۔ لامیہ کے لیے یہ بہتر فیصلہ ہے جسے وہ ابھی نہیں سمجھ رہی لیکن جلد سمجھ جائے گی۔ وہ میری بات نہیں ٹالتی اور میں اسے یقیناً قائل کر لوں گی کیونکہ میں بہت قریبی رشتوں کے طعنے سنے ہیں، اس بچی کے وجود پہ ایسے رکیک حملے کیے گئے ہیں جن سے میرا وجود چھلنی ہو گیا۔ اس کی خوشحال زندگی اور اپنے خاندان کا حوالہ ان بے حس لوگوں کے منہ پہ طمانچہ ہو گا۔'' وہ اپنی رو میں بول رہی تھی لیکن نہ جانے کیوں ابراہیم کو ایک ایک لفظ کی گہرائی شدت سے محسوس ہوئی۔ کلثوم اور لامیہ کی زندگی اجیرن کرنے والوں میں ان کے اپنے ہی قابل فہرست تھے۔

اسی پل ان کی نگاہ مہمان خانہ کے دروازے پہ کھڑے اذلان پہ گئی اور دل دکھ کے رہ گیا۔ اس کا دھواں دھواں ہوتا چہرہ سب باتیں سن لینے کا غماز تھا۔ وہ اس کی اذیت سمجھ سکتے تھے جسے پانے کی خواہش میں میلوں دور سے آیا تھا وہ اس کی دسترس سے بے انتہا فاصلے پہ کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں سے زندگی بے مقصد ہونے کا اشارہ مل رہا تھا لیکن وہ بے بس تھے..... اتنے بے بس کہ اسے دلاسہ بھی نہیں دے سکتے تھے۔ ان کی بہن اپنی نفرت کی آگ میں اپنا بیٹا جھونک چکی تھی۔ کاش وہ اس وقت اس کا زرد پڑتا چہرہ دیکھ پاتیں.....

انہیں صبح کا منظر یاد آیا جب وہ اپنے خونی رشتے ، اپنے چچا سے مل کر بے انتہا خوش تھا اور اب اسی چچا نے محبت چھن جانے کی نوید سنا کر وجود خالی کر دیا تھا۔ وہ جانتے تھے جسے چاہنا اسے پا لینا قسمت پہ منحصر ہے لیکن جب قسمت کی زمین پہ اپنے ہی ببول اگانے لگیں تو یہ دکھ تمام عمر پہ حاوی ہو جاتا ہے۔ وہ بنا کسی سے کچھ کہے لڑکھڑاتے قدموں سے واپس پلٹ گیا اور ابراہیم اسے ایک آواز تک نہ پائے۔

☆.....☆.....☆

شام گہری نہیں ہوئی تھی جب سیاہ سیلون سفید حویلی کا بلند اور آہنی دروازہ پار کرتے ہوئے پورچ میں آ کھڑی ہوئی۔ گاڑی کی آواز سنتے ہی شیماء، نور العین اور گل فوراً بیرونی حصے کی جانب چلے آئے تھے۔ ودود نے انہیں دیکھتے ہی اشارہ کیا تو گل اور نور العین فوراً آگے بڑھ آئیں، گل نے زارا کو سہارا دے کر گاڑی سے باہر نکالا اور نور نے حور العین کو بازوؤں سے تھام رکھا تھا۔ وہ سب سست روی سے چلتے ہوئے اندرونی حصے میں آئے تو سب ان کے منتظر تھے۔

''میرے مالک کا شکر ہے اس نے یہ دن دکھایا اور کسی بڑی مصیبت سے بچا لیا۔ حضور! صبح کا سورج نکلتے ہی صدقے کے بکرے ذبح کروائیں اور غریبوں میں بانٹیں۔'' انہوں نے اسی وقت کئی نوٹ ان دونوں کے سر سے وار کے گل کو پکڑا دیئے تھے۔

زارا عجیب خاموش اور ساکت نگاہوں سے سب کو دیکھ رہی تھی۔ ذہن کئی سوچوں کا مرکز بنا ہوا یہ اس کے چہرے کے واضح ہو رہا تھا۔ وہ آنے سے پہلے تاشفین کو دیکھ کر آئی تھی اور اس کے بعد سارا راستہ آنسوؤں سے جنگ جاری رہی۔ اس کی ٹانک کا زخم ابھی مکمل مندمل نہیں ہوا تھا اور کچھ ناساز ذہنی حالت کے پیش نظر شیماء اسے کمرے میں لے گئی تھیں۔ اسے نارمل ہونے کے لیے وقت چاہیے تھا اور ابھی تو اسے نبیل کے متعلق بھی معلوم نہیں تھا۔

''حور العین! مجھے معاف کر دو۔'' ودود وہاں آتی لامیہ کو دیکھنے میں مگن تھا جب بی جان کے جملے نے چونکا دیا۔

''نہیں بی جان ایسے مت کریں۔'' وہ فوراً ان کے قریب ہوئی تھیں۔ اس منظر کو وہاں موجود سب لوگوں نے بہت حیرانی سے دیکھا کیونکہ وہ سب تو اس حور کو جانتے تھے جو حویلی والوں کے قریب سے گزرنا بھی پسند نہیں کرتی تھی۔ اس کا ڈھکا سر، جھکی نگاہیں اور سادھا شفاف چہرہ تبدیلی کا اشارہ تو دے رہا تھا مگر یہ تبدیلی اس قدر گہری ہوگی اس کا کسی کو اندازہ نہیں تھا۔

''میں ہمیشہ تمہیں سمجھاتی رہی، تمہیں بدلنے کا کہتی رہتی اور تمہیں روکنے ٹوکنے میں اس قدر مصروف رہی کہ اپنے بیٹے کی کوتاہیاں نظر نہیں آسکیں۔ مجھے اسی وقت اس کا ہاتھ توڑ دینا چاہیے تھا جب

اس نے پہلی بار تم پہ ہاتھ اٹھایا تھا تو اس کی جرات اس قدر زیادہ نہ ہوتی۔ میں اس اذیت کا مداوا تو نہیں کر سکتی جو تمہیں میری انجانے میں برتی گئی غفلت کے سبب پہنچی لیکن آئندہ کے لیے یقین دلاتی ہوں ایسا کچھ نہیں ہوگا۔'' حورالعین کے بدلے انداز بی جان کی سوچ، لہجے، الفاظ سب کو نرم کر رہے تھے۔ انہوں نے سب پرانی باتیں بھولنے کے لیے پہلا قدم اٹھالیا۔

''بی جان! اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں۔ میں ہی اینٹ کا جواب پتھر اور تھپڑ کا جواب گھونسے سے دینے کا لائحہ عمل اپنائے ہوئے تھی۔ آپ کی نصیحتوں کو ایک دن قابل غور نہیں سمجھا اگر آپ کی باتیں سنتی سمجھتی تو شیماء بھابھی جیسی مطمئن زندگی گزارتی۔ سعد کو بدلنے کی دھن میں خود اس جیسی بنتی چلی گئی۔ میں آپ سب سے معافی مانگتی ہوں کیونکہ کہیں نا کہیں میں نے سب کو اذیت و تکلیف پہنچائی ہے اور سب سے زیادہ اپنی بیٹی کو جو ماں کے ہوتے ہوئے بھی ماں کے پیار کے لیے ترستی رہی۔'' آواز بھرا گئی تو بی جان نے اسے اپنے ساتھ لگالیا۔

''نوری بیٹا! ماں کو کمرے میں لے جاؤ اور گل سے کہہ کر پرہیزی کھانا تیار کرواؤ۔ سب پرانی باتیں بھول جاؤ میرا بچہ اللہ تعالی نے سب پہ بہت کرم کیا ہے۔'' نور کے سہارے کمرے کی جانب جاتے ہوئے حورالعین نے بے حد اچنبھے سے ایک کونے میں کھڑی سنہری آنکھوں والی لڑکی کو دیکھا۔ وہ اسے پہلی بار دیکھ رہی تھیں مگر چہرہ شناسا محسوس ہو رہا تھا کچھ تو اس کے چہرے پہ ایسا تھا جو نظر ہٹنے نہیں دے رہا تھا۔

''یہ لڑکی کون ہے؟'' بستر پہ لیٹنے بعد جیسے ہی سانس بحال ہوا فوراً نور سے پوچھا۔

''آپ سنیں گی تو حیران رہ جائیں گی۔'' وہ ان پہ لحاف اوڑھاتے ہوئے بولی۔

''تمہاری ماں نے اب حیران ہونا چھوڑ دیا ہے بیٹا.....'' ان کا لہجہ کھویا کھویا سا تھا۔

''ودود بھائی کی بیوی ہیں۔ انہوں نے کسی کو بتائے بغیر نکاح کر لیا۔'' وہ جو کچھ لمحے پہلے حیران نہ ہونے کا دعوی کر رہی تھیں اچنبھے سے اس کا چہرہ دیکھنے لگیں۔

''ایسے کیسے ہو سکتا ہے وہ تم منسوب تھا اور پھر ابا جان نے کس طرح ہونے دیا۔ وہ تو اس معاملے میں بے انتہا سخت ہیں جان لینے دینے پہ اتر آتے ہیں اور یہاں وہ اس لڑکی کو حویلی میں لے آیا اور

انہوں نے آرام سے اجازت دے دی.....'' یہ بات اتنی سادہ نہیں تھی جسے وہ آسانی سے ہضم کر لیتیں۔ انہیں اپنا وقت بخوبی یاد تھا۔

''پہلے تو بہت زیادہ غصے ہوئے۔ تائی جی اور بڑی امی بہت زیادہ پریشان ہو گئیں تھیں لیکن پھر بڑے ابا مان گئے بلکہ اب تو ولیمے کا اعلان بھی کر دیا ہے۔''

''لیکن کیسے.....'' انہیں اندر کہیں نا کہیں اس کا غم ستا رہا تھا۔ ان دونوں کا رشتہ ایک ضد کے تحت کروایا تھا لیکن اب وہ دل سے ایسا چاہتی تھیں۔ ان کی بیٹی عمر بھر آنکھوں کے سامنے رہتی اور شیماء بھابھی سے بڑھ کر اس کا کوئی خیر خواہ نہیں ہو سکتا تھا۔

''وہ کلثوم پھوپھو کی بیٹی ہے امی۔'' اس نے ایک نیا بم ماں کے اعصاب پہ گرایا۔ وہ کتنی دیر تو اسے نافہم نگاہوں سے دیکھتی رہیں جیسے اس کے حواس میں نہ ہونے کا شبہہ ہو۔

''تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے کیونکہ کلثوم تو.....''

''کوئی غلط فہمی نہیں ہے۔ وہ رقیہ پھوپھو کے ساتھ رہ رہی تھی کئی دنوں سے اور ودود بھائی بھی اس سے رابطے میں تھے۔'' ان کی حیرانی کم کرنے کے لیے آہستہ آہستہ ساری تفصیل بتاتی گئی۔ یہ ان کی زندگی کا سب سے انوکھا واقعہ تھا اور وہ تصور کی آنکھ سے سعد کی بے بسی دیکھ سکتی تھیں لیکن انہیں اس بات کی خوشی ہو رہی تھی حویلی میں قدیم روایات کے برخلاف فیصلے ہو رہے تھے انا کے بلند قامت بت ٹوٹ رہے تھے.....وجہ چاہے کوئی بھی ہو.....

☆.....☆.....☆

ودود کی متلاشی نگاہیں لامیہ کو تلاش کر رہی تھیں جو چند لمحے سب کے درمیان کھڑے رہنے کے بعد اوجھل ہو گئی۔ سب سے پہلے اپنا کمرہ دیکھا لیکن وہ وہاں نہیں تھی، راہداریوں میں گھوم کر دیکھ لیا مگر تلاش ختم نہیں ہوئی تبھی کچن کی جانب چلا آیا۔ کچن سے نکلتی نورالعین نے حیرانی سے اسے دیکھا کہ وہ بھلا کب اس جانب آتا تھا۔

''آپ کو کچھ چاہیے؟'' وہ امی کے لیے سوپ لے کر جا رہی تھی کہ اسے دیکھ کر رک گئی اور اسے

کسی چیز کی ضرورت نا ہوا سی خیال کے تحت رک کر پوچھنے لگی۔

''لامیہ کہیں نظر نہیں آ رہی۔'' اس نے سرسری نگاہوں سے کچن میں بھی دیکھ لیا تھا اور اسے نہ پا کر اب نورالعین کے جواب کا منتظر تھا۔

''میں نے انہیں باہر جاتے دیکھا تھا۔'' وہ جب امی کے کمرے سے نکلی تب وہ عقبی راہداری کی جانب جاتے دکھائی دی تھی۔ نورالعین کے بولتے ہی مزید کچھ سنے وہ فوراً عقبی باغ کی جانب بڑھ گیا۔

وہ دور سے ہی راہداری کا دروازہ کھلا دیکھ چکا تھا اور دل میں کہیں اطمینان کی لہر پیدا ہوئی تھی۔ اس کے دکھائی نہ دینے پہ نہ جانے کیسے کیسے خطرناک خیالوں نے گھیر رکھا تھا۔ دروازہ پار کرتے ہی برآمدے میں بچھے بڑی امی کے تخت پہ سائے کا گمان ہوا، یہاں مکمل اندھیرے کو دیکھتے ہوئے پہلے روشنی کرنے کا سوچا پھر خود ہی ارادہ ترک کرتا ہوا آہستگی سے آگے بڑھ آیا اور تخت پہ اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ وہ چونکی اور نہ اس نے چہرہ موڑ کر اسے دیکھا۔

''میں تمہیں کتنی دیر سے ڈھونڈ رہا تھا ایک لمحے کے لیے تو بے انتہا ڈر گیا تھا۔'' اس کی محویت نہ ٹوٹی تو ودود نے گفتگو کا آغاز کیا۔

''تمہیں لگا میں بھاگ گئی۔'' وہ دیکھ نہیں رہی تھی مگر بات کرنے پہ آمادہ تھی ودود کے لیے یہ ہی غنیمت تھا۔

''شائد.....''

''ایسا ہو بھی سکتا ہے اس لیے مطمئن ہونے کی ضرورت نہیں۔'' وہ اپنے رنگ میں واپس لوٹ رہی تھی۔

''یہاں سے بھاگنا اتنا آسان نہیں ہے۔'' اس کے لہجے میں اپنی ذات کا زعم تھا مگر مقابل کچھ اور سمجھا تھا۔

''اور یہ تمہاری سب سے بڑی بھول ہے میں یہاں اپنی مرضی سے آئی تھی اور اپنی مرضی سے چلی جاؤں گی۔ تم مجھے روکنے کا حق نہیں رکھتے اور مجھے امید ہے ایسی کوئی غلطی کرو گے بھی نہیں۔'' لامیہ نے

اس کا خود ساختہ زعم پل میں خاک کیا تھا۔

''کیا میں پوچھ سکتا ہوں لہجے میں یہ کڑواہٹ کس لیے ہے؟'' وہ اس سے باتیں کرنا چاہتا تھا بحث نہیں اس لیے فوراً مدعے کی بات کی۔

''کیا تمہیں نہیں پتا؟'' اب کی بار چہرہ ہی نہیں وہ ساری کی ساری اس کی جانب مڑی تھی۔ لہجہ کڑوا، چہرہ سرخ اور آنکھوں میں غصے کی مدھم سرخ لکیر..... وہ پہلی بار کسی لڑکی کے حسن پہ ٹھٹکا تھا۔

''اتنے بے خبر لگتے تو نہیں ہو جتنا ناٹک کر رہے ہو۔ تم سمجھتے ہو میں بے وقوف ہوں جو مان لوں گی کہ یہاں سارے فیصلے تمہاری مرضی کے بغیر کیے جا رہے ہیں۔ میں اب تمہارے کسی پلان کا حصہ نہیں بنوں گی مسٹر ودود اس لیے شرافت سے اپنے گھر والوں کو یہ اوٹ پٹانگ حرکتیں کرنے سے منع کرو۔'' وہ بول رہی تھی اور ودود سب کچھ بھلائے اسے دیکھنے میں مگن تھا۔ اس کی شستہ اردو سننا ایک پر لطف مشغلہ تھا۔

''اب جواب دو.....'' اسے خاموش دیکھ کر وہ مزید برہم ہوئی۔

''کس کا جواب.....؟''

''جو ابھی میں نے پوچھا۔'' وہ اسے مزید سننا چاہتا تھا لیکن برہم انداز دیکھ کر ارادہ بدل دیا۔

''مجھے واقعی نہیں پتا تم کس فیصلے کی بات کر رہی ہو۔'' وہ مکمل لاعلم تھا۔

''تمہارے گھر والے ہمارے رشتے کو آفیشلی اناؤنس کرنا چاہتے ہیں۔''

''تو کرنے دو اس میں مسئلہ کیا ہے۔'' لامیہ کا دل چاہا اس کا سر پھاڑ دے۔

''تم اس نکاح کی حقیقت جانتے ہو۔ سب کچھ تم پہ واضح ہے، مجھے تمہارے ساتھ کسی تعلق میں بندھنا ہے اور نہ ہی یہ رشتہ آگے بڑھانا ہے۔ ہم دونوں جانتے ہیں کسی موڑ پہ ہمیں اچھے طریقے سے الگ ہو جانا ہے تو پھر یہ تقریب کس لیے؟ اس سب کا کیا مقصد ہے؟'' اس کی بے فکری لامیہ کو مزید تپا رہی تھی اس لیے وہ سب لحاظ بھلائے بولتی چلی گئی۔

''میں نے یہ نکاح مکمل رضامندی اور دلی آمادگی سے کیا ہے لامیہ۔ یہ کوئی کھیل ہے جسے من بھر

جانے پہ چھوڑ دیں گے عمر بھر کا فیصلہ ہے جسے کم از کم میں نے مکمل دیانتداری سے شروع کیا ہے۔ آپ جو سوچتی ہیں وہ آپ کا دردِ سر ہے اور میرے گھر والے اس سے بالکل بے خبر ہیں۔ اس لیے آپ فی الحال خود کو ہر قسم کی سوچوں سے آزاد رکھیں اور یہاں اچھا وقت گزارنے کی کوشش کریں۔'' اس کی بے تکی باتوں نے سنجیدہ ہونے پہ مجبور کر دیا تھا۔

''میں کسی تقریب کا حصہ نہیں بنوں گی ودود اور مجھے اس بات سے بھی کوئی غرض نہیں کہ تم نے یہ نکاح کیوں اور کس وجہ سے کیا..... اس لیے پلیز اپنے گھر والوں کو منع کرو۔''

''آخر تمہیں اس تقریب سے مسئلہ کیا ہے؟ نکاح ہو چکا ہے، تم اس نکاح سے منسلک کوئی ذمہ داری لینے کے لیے تیار نہیں ہو اور نہ میں نے تمہیں مجبور کیا ہے تو یہ تقریب بھی ہو جانے دو۔ جب تم کچھ تسلیم ہی نہیں کرتی تو تمہیں کس بات کا خوف ہے؟ جیسے نکاح کے بعد رہ رہی ہو ویسے ہی تقریب کے بعد بھی رہو گی اس لیے پلیز اب دوبارہ اس ٹاپک پہ بات مت کرنا۔'' وہ ایک ہی بات پہ اڑ چکی تھی شائد اسی وجہ سے ودود کے لہجے میں بھی غصہ عود آیا تھا۔

''تم پاگل ہو چکے ہو کیا؟ مجھے ساری عمر یہاں نہیں رہنا ہے۔ مجھے سڈنی واپس جانا، اپنا سمیسٹر فریز کروا کے آئی ہوں۔ میری زندگی یہاں نہیں وہاں ہے تم کیوں میرے مسائل میں اضافہ کر رہے ہو۔ تم یہاں مجھے صرف ان سب سے ملوانے لائے تھے تو پھر ولیمہ، تقریب یہ سب کہاں سے آ گیا؟'' وہ حد سے زیادہ الجھ رہی تھی۔

''تم بلاوجہ پینک کر رہی ہو لامیہ میں تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا۔ پلیز ایک بار آرام سے میری بات سن لو تو ساری الجھن ختم ہو جائے گی۔'' اس نے نہایت آرام سے لامیہ کا ہاتھ تھاما۔ وہ جو آنکھوں میں آئے آنسو واپس دھکیلنے کی کوشش کر رہی تھی اس لمس پہ بے بس ہو گئی۔ آنسو زار زار بہنے لگے تھے۔

''تم اس طرح رو کر مجھے پریشان کر رہی ہو لامیہ۔'' اس نے ہاتھ آگے بڑھا کر آنسو اپنی پوروں پہ سمیٹ لیے۔

''مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ سب اس قدر مشکل ہو گا۔'' لہجے سے چند لمحے پہلے والا غصہ ناپید تھا۔ وہ

جذباتی توڑ پھوڑ کا شکار تھی ودود واضح سمجھ رہا تھا۔

''کچھ بھی مشکل نہیں ہے لامیہ۔ میں تمہارے ساتھ ہوں، تم جیسا چاہو گی ویسا ہوگا اس لیے باقی سب کیا کر رہے ہیں یہ بھول جاؤ۔ گھر والے جو کرتے ہیں کرنے دو تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم یہاں کیوں آئی ہو، کیا چاہتی ہو مجھے سب معلوم ہے اس لیے مجھ پہ یقین رکھو۔'' اس کے ملاحت زدہ لہجے نے لامیہ کو پرسکون کر دیا تھا۔ اس کے لہجے میں تاثیر تھی یا لمس میں وہ سمجھ نہیں پائی لیکن اسے بولنے سے روکا اور نہ ہی ہاتھ گرفت سے آزاد کروایا۔

''ویسے بھی ابھی مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔''

''کیسی مدد.....؟'' نم آنکھوں میں حیرانی جھلکی۔

''میں چاہتا ہوں اس رشتے کی آڑ میں نور العین کے لیے کوئی بہتر فیصلہ ہو جائے اگر کسی کو تمہارے ارادوں کی بھنک بھی پڑ گئی تو وہ مجھے اور نور کو دوبارہ ایک رشتے میں باندھنے کے درپے ہو جائیں گے۔ اس لیے پلیز صورتحال کو سمجھو..... اپنی فیملی کے آنے اور نور العین کے اس حویلی سے جانے تک خاموش رہو۔ تم نور کی مدد کے لیے اتنا تو کر ہی سکتی ہو۔'' ودود پر امید نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''بہت مشکل انسان ہو تم.....'' آنسو صاف کرنے کے بعد اسے گھور کر دیکھنے لگی تھی۔ ودود کو اس کے بدلتے انداز میں اپنا جواب مل گیا۔

''ویسے خوبصورت لڑکیوں کو اتنے اندھیرے اور ویرانے میں اکیلے نہیں بیٹھنا چاہیے جن عاشق ہو جاتے ہیں۔'' اس کی اداسی دور کرنے کے لیے وہ شرارت پہ آمادہ تھا۔

''اگر مجھے ڈرانے کی کوشش ہے تو نہایت فضول ہے۔ مجھے ڈر نہیں لگتا.....''

''ہاں جی۔ آپ تو ڈرانے والوں میں سے ہیں۔'' ودود کی آواز اتنی ضرور تھی کہ وہ آرام سے سن چکی تھی اور بے ساختہ مسکرا بھی دی۔ ودود کو اپنی کوشش کامیاب ہوتی نظر آئی تو اپنی تھکن بھلائے اس کے ساتھ کتنی ہی دیر وہاں بیٹھا رہا۔ اپنے مزاج کے برعکس کئی الٹی سیدھی باتیں کیے اسے ہنسانے کی کوشش کرتا رہا۔

''کھانے کا وقت ہو گیا میرا خیال ہے اندر چلنا چاہیے۔'' اس کے کہنے پہ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

اس کے ساتھ چلتی اندرونی مجلس میں چلی آئی۔ وہ باتوں میں اس قدر مگن تھی کہ ہاتھ پہ اب تک اس کی گرفت کا احساس نہیں ہوا مگر دیکھنے والوں نے یہ منظر جی بھر کے دیکھا۔ بی جان ان دونوں کو ہنستا مسکراتا دیکھ کر بے انتہا مطمئن ہو گئی تھیں۔

☆.....☆.....☆

بچھڑنا یہ نہیں ہوتا
کہ کوئی شخص ہم سے دور ہو جائے
دیا بے نور ہو جائے
محبت دوریوں کی کیفیت میں بھی محبت ہے
ارادے ہار جانے سے
سمندر پار جانے سے
تعلق ٹوٹتے کب ہیں
تعلق ٹوٹنا ہو تو
کسی نے روٹھنا ہو تو
ذرا سی دیر لگتی ہے
شجر کوئی
زمیں میں جڑ پکڑنے سے بہت پہلے ہی مر جائے
کدورت دل میں بھر جائے
کوئی حد سے گزر جائے
تو پھر ہونے نہ ہونے سے
کسے کیا فرق پڑتا ہے
محبت کرنے والوں کو

جدائی کا کبھی صدمہ نہیں ملتا
سو اب یہ طے ہوا دراصل
لاحاصل تعلق ہی جدائی ہے
یہی سچ ہے
ارادے ہار جانے سے
سمندر پار جانے سے
تعلق ٹوٹتے کب ہیں!

رات گہری..... بے انتہا گہری تھی اور رات جیسا اندھیرا ہی وجود کے اندر چھایا محسوس ہو رہا تھا۔ خاموشی اس قدر دبیز کہ دھڑکنوں کے خاموش ہو جانے کا خدشہ لاحق تھا لیکن وہ کھڑا تھا۔ وسیع چھت کے ایک کونے میں دیوار سے ٹیک لگائے خاموش کھڑا تھا۔ کچھ کہنے سننے کو باقی نہیں تھا بس ملال تھا جو چیخ چیخ کر رونے پہ اکسا رہا تھا۔ ایک درد تھا جو آنکھ کے راستے بہہ رہا تھا۔

چند لمحے پہلے وہ بے انتہا خوش تھا۔ اس نے پاکستان آ کر پہلی بار موبائل آن کیا تو لامیہ کی کئی میسجز، کئی واٹس ایپ کالز کے نوٹیفیکیشن موبائل سکرین پہ روشن تھے۔ اس وقت اس پہ شادی مرگ کی کیفیت طاری ہو گئی۔ یہ پہلی بار تھا کہ اس کے منانے سے پہلے وہ مان گئی، اس بار کسی معذرت کسی وضاحت کسی تاویل کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ اس نے پہلی بار خود اذلان کو پکارا تھا۔ وہ نہ جانے کتنی بار سب میسج پڑھ چکا تھا اور جب آنکھوں کے دھوکے کا امکان نہیں رہا تو فوراً آنٹی کو بتانے کے لیے مہمان خانے کی جانب چلا آیا۔

اس کے قدم خوشی کے باعث زمین پہ نہیں ٹک رہے تھے اور پھر اسے اپنا وجود زمین میں دفن ہوتا محسوس ہوا۔ اندر سے آتی آوازیں اس کی موت کا اعلان کر رہی تھیں۔ دل سکڑ کر پھیلا، دھڑکن رک رک کر چلنے لگی، اسے لگا وہ گر جائے گا مگر وہ کھڑا رہا۔ ہاں..... وہ بنا کسی سہارے کے ساکت سا کھڑا رہا حالانکہ اسے گر جانا چاہیے تھا..... نہیں..... مر جانا چاہیے تھا۔ اس کے وجود میں یک لخت ویسے بین

گونجنے لگے جیسے صبح اس چار دیواری میں گونج رہے تھے۔ بالکل ویسا ہی سکتہ طاری تھا۔

وہ واپس پلٹ آیا۔ بہت مشکل تھا اپنے قدموں پہ خود چل کر واپس آنا مگر وہ چلتا رہا۔ اسے کسی کونے کی تلاش تھی جہاں وہ مرگ تمنا پہ نوحے بھرتا، جہاں وہ اجڑے دل کا سوگ مناتا سو وہ چلتا رہا۔

حزن کا کوئی وجود ہوتا تو اس کی آنکھیں ہوتیں.....

ملال کا وجود ہوتا تو اس کا چہرہ سو فیصد مشابہت رکھتا۔

بے مول ہونے کی بہترین صورت وہ خود تھا.....

بھلا ایسا کب ہوتا ہے۔ اس قدر قریب آ کر ایسا کب ہوتا ہے؟

محبوب آواز دے اور اس آواز پہ آپ کا حق نہ رہے ایسا کب ہوتا ہے؟

صبر مر چکا تھا..... حوصلہ ناپید تھا..... بس آنسو زندہ تھے.....

دیوانگی، بے خودی، خود فراموشی، وحشت..... سب ایک جگہ جمع تھیں۔

حسرت دل کو مانند پروانہ جلا رہی تھی۔

وہ ذرہ ذرہ ہو کر بکھر رہا تھا..... بکھر بکھر کر ٹوٹ رہا تھا۔

''لامیہ.....'' وہ ایک دم اس قدر زور سے چیخا کہ ہوا بھی سہم گئی۔ اس نے رک کر گریہ کرتے شخص کو دیکھا اور فوراً اس پہ بیتنے والی داستان جان لی۔ اس نے محبت کے گیت پہ جھومتے ایسے کئی دیوانے دیکھ رکھے تھے یہ واردات نئی نہیں تھی۔ مژدہ وصال ایسے لوگوں کے نصیب میں نہیں ہوتا۔ ایسی واردات وہ ازل سے دیکھتی آئی تھی سو سر جھٹک کے گزر جانا چاہا مگر اس حسین جوان کی آہ و فغاں کو نظر انداز کرنا آسان کہاں تھا؟

وہ دھیرے سے اس کے پہلو میں اتر آئی، اس کے کندھے پہ تھپکی دی اور سر اپنے سینے پہ دھر لیا مگر وہ متوجہ کہاں تھا۔ وہ کسی ایسی دنیا کا مسافر تھا جہاں تسلی و دلاسے کسی کام کے نہیں..... وہ پھر بھی بیٹھی رہی، اس کے آنسو چنتی رہی، اس کی آہ و زاری کو اپنے وجود میں سمیٹتی رہی۔ وہ محبت کے ہاروں کے لیے بس یہ ہی کر سکتی تھی لیکن اس بے حال دیوانے کی تڑپ دیکھ کر پہلی بار عشق کے دیوتا سے اس کی سفارش کرنے کی ٹھان لی۔

''اذلان.....!'' ابراہیم اسے تلاش کرتے وہاں چلے آئے۔اس کی ٹوٹی بکھری حالت دیکھ کر اس قدر بے چین ہوئے کہ ننگی زمین پہ بیٹھتے ہوئے اس کو خود میں سمیٹ لیا۔

''ایسے روتے نہیں ہیں میرے بچے.....'' وہ اسے کسی بچے کی مانند اپنے ساتھ لگائے ہوئے تھے۔

''میں نے آنے میں دیر کردی انکل.....اسے منانے میں دیر کردی۔'' انہوں نے کسی بچے کو اپنی من پسند چیز کھو جانے پہ بھی ایسا واویلا کرتے نہیں دیکھا تھا۔

''وہ تم سے ناراض نہیں ہے اذلان۔'' انہیں سمجھ نہیں آرہا تھا اسے کیسے سنبھالیں۔

''اس نے مجھے پکارا.....بہت پکارا لیکن میں اس کی کوئی مدد نہیں کر سکا۔میں تو اس کی ہر پکار پہ پہنچ جاتا تھا انکل اس بار دیر کیسے کردی۔'' وہ ان کی کوئی بات نہیں سن رہا تھا بس روئے جا رہا، بولتا جا رہا تھا۔

انہیں اس کی وحشت سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔اس کے لیے ڈر لگ رہا تھا لیکن وہ کسی طرح قابو میں بھی نہیں آرہا تھا۔وہ کچھ سنتا سمجھتا تو اسے یہاں سے اٹھا کر نیچے لے جاتے۔اس وقت نیند اس کے لیے بے انتہا ضروری تھی۔کچھ لمحے سوچا پھر وہیں دیوار کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے اور اس کا سر اپنی ٹانگوں پہ رکھ لیا۔وہ روتا رہا.....وہ آنسو سمیٹتے گئے۔وہ بولتا رہا.....وہ سنتے رہے۔ رات دھیرے دھیرے سرکنے لگی۔ہوا نے اپنائیت کا یہ رنگ دیکھا تو وہاں سے رخصت ہوئی اور دھیمی رفتار سے دوبارہ بہنے لگی۔

❁ ❁

ناول **مرگِ تمنا** ابھی جاری ہے۔اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی **1** تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔